آدرش
مسلم شمیم

# آدرش

مسلم شمیم

جاوداں

مرتب: حسین انجم

(طلوعِ افکار میں شائع ہونے والے اداریوں پر مشتمل نثری مجموعہ)

اشتراک و تعاون ــــــ لاڑکانہ سنگت

کتابت و سرورق: جاوداں لیزر کمپوزرس، کراچی

ناشر: جاوداں پبلشرز، کراچی

تعداد: ایک ہزار قیمت دو سو پچاس روپے

(یہ مجموعہ مضامین جاوداں پبلشرز، ۲۸۰-بی، رضویہ سوسائٹی، کراچی ۷۴۶۰۰، فون: ۴۹۵۳۴۳، ۴۹۸۳۴۳۰، ۴۹۸۵۹۶۵ سے طلب فرمائیے)

۵
۷
۱۳

# ترتیب



## ادب اور نظریہ



## ادب اور جمہوریت



## اظہار و ابلاغ

## شخصیات



## ذات اور اظہارِ ذات

# انتساب

مرحوم ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد کے نام

# ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد

ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد ایک غیر معمولی شخصیت کا نام ہے۔ مرحوم کی غیر معمولی شخصیت کی اساس کئی اوصاف سے عبارت تھی۔ وہ ایک اچھے انسان، بہت اچھے دوست اور بڑے صاحبِ علم و دانش ہونے کے علاوہ ایک بے لوث سماجی کارکن اور صاحبِ خیر شخص تھے۔ مرحوم کی کثیر الجہت شخصیت سے تعارف و شناسائی بھی میرے حصے میں مرحلہ وار آئی۔ ۱۹۸۵ء میں جناب سلیم راز کی وساطت سے میری ان سے ملاقات ہوئی جب میں ۱۹۸۶ء منعقد ہونے والے چار روزہ ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں معروفِ عمل تھا جس کی تیاریاں آٹھ مہینے میں مکمل ہوئی تھیں۔ اس کانفرنس کی مرکزی تنظیمی کمیٹی کے ایک رکن ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد بھی تھے جبکہ جناب شوکت صدیقی صدر اور میں جنرل سکرٹری تھے۔ سبطِ حسن اس کانفرنس کے روحِ رواں تھے اور اس troika کے سربراہ تھے جو مسلم شمیم، مظہر جمیل اور راحت سعید پر مشتمل تھا۔ ان آٹھ مہینوں میں ہونے والے بعض اجلاس مرحوم کی قیام گاہ واقع ایچ بلاک، نارتھ ناظم آباد میں منعقد ہوئے۔ گویا اس کانفرنس کی تیاریوں میں ہم لوگوں کے ساتھ وہ ہمہ تن معروف اور شریکِ سفر تھے۔ جس خلوص اور لگن کا انھوں نے

مظاہرہ کیا، وہ سب احباب کے دل پر آج بھی نقش ہے۔ ان آٹھ مہینوں میں ایسی قربت اور ایسے خلوص و محبت کے رشتے استوار ہوئے جو ڈاکٹر ناشاد کی زندگی کے آخری ایام تک قائم و دائم رہے۔ ان سے ملاقاتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم رہا مگر یک بیک بے سان و گمان منقطع ہو گیا اور وہ بغیر پیشگی اطلاع کے یک طرفہ خود رشتے ناتے منقطع کر کے ہمیشہ کے لیے ہم لوگوں سے جدا ہو گئے۔ ان کی وفات کی خبر احباب کو کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہوئی، کیونکہ ۲۹ جون ۱۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہوا تھا اور ان کی میت کو بغیر کسی تاخیر و اطلاع کے ان کے آبائی شہر لے جایا گیا اور سپردِ خاک کیا گیا۔ اہل کراچی بعد میں اس سانحے کے صدمات سے دوچار ہوئے اور ڈاکٹر مطیع اللہ نے اس طرح ہم لوگوں کو ناشاد کیا کہ جس کا کوئی اندازہ اور خیال نہ تھا۔

وہ ایک وسیع القلب انسان تھے اور ان کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ وہ ایک جانے پہچانے ترقی پسند نظریے کے آدمی تھے مگر ان کے سماجی تعلقات ان کی وسیع المشربی اور وسیع النظری کے حامل تھے۔ ان کے یہاں تنگ نظری اور تعصب کا کوئی شائبہ نہیں ملتا تھا۔ کتاب سے والہانہ عشق ان کی علم دوستی اور ان کی دانش وری کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ انھوں نے اپنی آمدنی کا گراں قدر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کیا پشاور اور کراچی میں کتابوں کے دو ایسے ذخیرے انھوں جمع کیے تھے جو دو کتب خانے کہلانے کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ کتابیں جمع کرنا خود ایک بڑا کام ہے، مگر میں نے ان کو ایک ایسا صاحب مطالعہ شخص پایا جس کی مثال کم ملتی ہے۔ میں نے جس موضوع پر ان سے رجوع کیا، انھوں نے حوالوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اردو ادب اور متعدد سماجی علوم کے علاوہ انگریزی ادب پر ان کا بڑا وسیع مطالعہ تھا۔ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ اس مطالعے کا حاصل علمی اور ادبی حلقے کو ضرور بہم پہنچاتے۔ مرحوم بیک وقت متعدد موضوعات پر مواد اور notes جمع کر رہے تھے جو یقیناً متعدد کتابوں کی صورت میں منصۂ شہود پر آتے۔

وہ ایک دانش ور اور صاحبِ علم و فضل ہونے کے علاوہ تخلیقی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے ۔ اور شاعری اور افسانے کے شعبوں میں انھوں نے اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کیا تھا ۔ میں نے ان کی متعدد نظمیں پڑھیں اور خود ان سے سنیں جن کی بنیاد پر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ مستقبل میں ادب کی دنیا میں اپنی ایک پہچان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ انھوں نے افسانے بھی تخلیق کیے جو میں نے نہیں پڑھے وہ اردو اور پشتو، دونوں زبانوں میں ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ میں نے ان کے صاحب زادے خوشحال خاں سے زور دے کر کہا ہے کہ وہ ان کی تحریروں کو سامنے لائیں تاکہ ان کے تخلیقی جوہر کا لوگوں کو اندازہ ہو سکے ۔ مختلف موقعوں پر مختلف موضوعات پر ان سے تبادلۂ خیال کے مواقع بھی آئے اور ان لمحوں میں اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے اور وہ کس پائے کے صاحبِ علم و دانش تھے ۔ اس مطالعے اور فکر و دانش کے رکھنے والے میرے نزدیک کم یاب ہوتے ہیں ۔ کاش زندگی انھیں اس مطالعے کا حاصل اور فکر و دانش کی روشنی پھیلانے کی مہلت دے دیتی

ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد ۱۹۳۴ء میں صوبہ سرحد کے ایک علمی اور تہذیبی ورثے کے امین خانوادے میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والدِ گرامی مولانا عبدالسلام ایک معروف عالم اور ممتاز معلم تھے ۔ مرحوم نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والدِ گرامی سے حاصل کی ۔ علم و ادب سے شغف انھیں ورثے میں ملا تھا ۔ وہ بچپن سے شعر و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے ۔ بحیثیتِ طالب علم وہ اپنے ابتدائی دور سے نہایت ہونہار اور ممتاز حیثیت کے مالک رہے اور ہمیشہ اپنے کلاس میں اول آتے رہے ۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی اور غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر انھیں وظیفے کا حق دار گردانا گیا ۔ وہ اپنے اساتذہ کے عزیز ترین شاگردوں میں رہے ۔ انھوں نے مردان کے ایک اسکول سے میٹرک پاس کیا ۔ کچھ عرصے گورنمنٹ کالج مردان میں زیرِ تعلیم رہے اور جلد ہی اسلامیہ کالج پشاور سے وابستہ ہو گئے ۔ وہ سائنس کے طالبِ علم ہونے کے باوجود کالج کی ادبی سرگرمیوں میں پیش

پیش رہے ۔ واضح رہے کہ اسلامیہ کالج طلبا سیاست اور دیگر صحت مند غیر تدریسی سرگرمیوں کا اس دور میں ایک اہم مرکز ہوا کرتا تھا ۔ ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد نے کالج کی تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مذکورہ کالج کے ممتاز طلبا کی فہرست میں ان کا نام شامل ہوا ۔ انھوں نے کالج میگزین کے لیے مضامین بھی لکھے ، غزلیں اور نظمیں بھی لکھیں اور اس دور کے اردو اور پشتو مشاعروں میں بحیثیتِ شاعر شرکت کی اور مقبولیت حاصل کی ۔

انھوں نے اپنی مرضی کے خلاف اپنے والد کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے خیبر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا مگر جلد ہی کالج کی طلبا سیاست میں حصہ لینے اور قائدانہ کردار ادا کرنے کی پاداش میں انھیں خیبر میڈیکل کالج سے نکال دیا گیا اور وہ کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج کے طالبِ علم بنے جہاں سے انھوں نے ۱۹۷۳ء میں ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس کی سند حاصل کی ۔ کراچی ان کے شعوری سفر کے لیے اور زیادہ سازگار اور وسیع تر ماحول ثابت ہوا ۔ ڈاؤ میڈیکل کالج کے عرصۂ تعلیم سے لے کر اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ زیادہ تر یہیں قیام پذیر رہے بجز تقریباً ان آٹھ سالوں کے جب وہ بسلسلۂ ملازمت ایران میں مقیم تھے اور یہاں کی ادبی اور علمی شخصیات سے ان کی قربتیں قائم ہوئیں اور وقت کے ساتھ وسیع تر ہوئیں ۔ وہ یہاں کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کا جزوِ لاینفک بن گئے اور علم و ادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، خاص طور پر ۱۹۸۶ء کے P.W.A. کی گولڈن جوبلی کانفرنس میں ان کی خدمات اور کارکردگی ناقابلِ فراموش رہی تھی ۔ وہ اس کانفرنس کی مرکزی تنظیمی کمیٹی کے رکن ہونے کے علاوہ کانفرنس کے دوران قائم ہونے والی مجلسِ قائمہ کے رکن رہے اور کامریڈ سوبھو گیان چندانی اور سبط حسن کے ساتھ مل کر کانفرنس کی مقصدیت اور معنویت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ یہ کانفرنس ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ تھی ۔

اپنے کراچی کے طویل عرصۂ قیام میں انھوں نے ادیب فاضل اور منشی فاضل

کی سندیں نمایاں طور پر حاصل کیں۔ علاوہ بریں انھوں نے کراچی یونی ورسٹی سے اردو ادب، فارسی ادب، نفسیات، تاریخ اور عمرانیات میں ایم۔اے کی اسناد حاصل کیں اور ایل ایل۔بی اور ایل ایل۔ایم کی ڈگریاں بھی حاصل کیں، خصوصیت کے ساتھ فارسی میں گولڈ میڈلسٹ کی حیثیت سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ فارسی کے ایک مضمون میں پی ایچ۔ڈی کر رہے تھے کہ زندگی نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ اتنے مضامین میں ایم۔اے کی اسناد حاصل کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ علم کی جستجو اور حصول علم کا عظیم جذبہ اور شوق کامل رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے کراچی کے گھر میں سات ہزار کتابوں کا عظیم ذخیرہ جمع کر لیا تھا جو ان کے شغف علم و ادب اور علمی منصب کا فقید المثال ثبوت ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بے محل نہ ہو گی کہ مرحوم ہر اتوار کو ریگل چوک پر منعقد ہونے والے پرانی کتابوں کے بازار کے سب سے نمایاں خریدار تھے اور ہر اتوار کو وہ ہزاروں روپے کی کتابیں خرید کر اپنی گاڑی میں بھر کر لے جایا کرتے تھے۔ ان کی بیوی اور بچوں کو یہ بجا طور اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب کتابیں انھیں اس گھر سے ہجرت پر مجبور کر دیں گی۔ یہ مرحلہ ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد کی بے وقت موت کے سبب اہل خاندان کو درپیش نہ ہوا جس کے وہ خندہ پیشانی سے منتظر تھے۔

ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد اب علم و فضل کے اس مقام پر فائز ہو گئے تھے کہ وہ ادبی اور علمی دنیا کو بہت کچھ دے سکتے تھے۔ انھوں نے اس طرف توجہ کی تھی اور اپنے آخری ایام میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ادبی جریدے 'قند' اور 'تمثال' کے علاوہ کئی دوسرے ادبی رسالوں میں ان کی تحریریں شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ہمیں اس بات کا انتظار رہے گا کہ ان کے لائق و فائق صاحب زادے خوشحال خاں، جو پاکستان ایر فورس میں ایک اہم منصب پر فائز ہیں، اس طرف توجہ کریں گے اور ان کی تحریریں شائع کرانے میں مستقبل قریب میں عملی حصہ لیں گے۔

مرحوم نے ۲۹ جون ۱۹۹۶ء کو ۵۲ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے پس ماندگان میں ان کی بیوہ کے علاوہ دو صاحب زادگان اور دو صاحب زادیاں شامل ہیں۔ بڑا بیٹا خوشحال خاں پاکستان ایر فورس کا ایک افسر ہے، دوسرا بیٹا فرسٹ ایر سائنس کا طالب علم ہے اور دونوں صاحب زادیاں میڈیکل کالج کی طالبات ہیں اور مستقبل قریب میں اپنے والد کی ہم پیشہ، یعنی ڈاکٹر بن جائیں گی۔

ڈاکٹر مطیع اللہ ناشاد کے لیے میرے دل میں بڑی قدر و قیمت ہے۔ وہ دیگر اوصاف کے علاوہ دوستی کی صفات سے مالا مال تھے، اور آڑے وقت میں کام آنا ان کے مسلک میں شامل تھا۔ وہ میرے آڑے وقتوں کے دوستوں میں ایک نمایاں نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نظریاتی رشتوں میں بندھے ہونے کے علاوہ مرحوم کے ساتھ اپنی ذاتی دوستی کو بڑی اہمیت دیتا ہوں جو خود نظریاتی دوستی کی ہی دین ہے۔

مسلم شمیم

# گفتنی

اگر درویش بر حالے بماندے
سرِ دست از دو عالم برفشاندے

مسلم شمیم صاحب کا حال بھی بقول حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ چنداں مختلف نہیں ۔ وہ بھی شیخ کے ممدوح درویش کی طرح:

گہے برطارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

کے مصداق سلوک کے کسی ایک مقام پر استقرار نہیں کرتے لیکن بمطابق حافظ شیراز:

سینہ از آتشِ دل در غم جانانہ بسوخت
آتشے بود دریں خانہ کہ کاشانہ بسوخت

اہل خرقہ نہ ہی لیکن یکے از صاحبدلاں ضرور ہیں ، کیونکہ انھوں نے جب ہوش کی

آنکھیں کھولیں تو دیکھنے کی طرح جس چہرے کو دیکھا وہ خانقاہِ عمادیہ کے صاحبِ علم و فضل سجادہ نشین سید شاہ صبیح الحق کا نورانی چہرہ تھا اور سننے کی طرح جس آواز کو سنا وہ مولانا آزاد سبحانی کے مواعظِ حسنہ تھے۔ سات آٹھ برس کے سن سے بارہ پندرہ برس تک یعنی کامل سات آٹھ سال تک لودی کٹرہ میں اپنے استاد حمید عظیم آبادی شاگردِ حضرتِ شاد عظیم آبادی کے مکان پر، جہاں مولانا آزاد سبحانی کا دورۂ بہار کے دوران کئی کئی دن قیام ہوتا، ان کے مواعظِ حسنہ سے مستفید ہونے کے بکثرت مواقع ملتے۔ مولانا آزاد سبحانی حضرت مولانا حسرت موہانی کی طرح اپنے عہد کی روحِ انقلاب تھے اور تمام تر زہد و اتقا اور تقشف کے باوجود، جو ان کی ذات کا احاطہ کیے ہوئے تھے ان کا فکری میلان اشتراکیت کی طرف تھا:

وین عجب بیں کہ چہ نورے ز کجا می بینم

دوسری طرف خانقاہِ عمادیہ کے صاحبِ فضلیت سجادہ نشین حضرت سید شاہ صبیح الحق کی مقناطیسی شخصیت، وہاں کے شاندار اور شکوہ آثار در و بام اور اس صدیوں کی متصوفانہ اقدار در آغوشِ عمارت کا عظیم الشان کتب خانہ جہاں بھاری بھرکم منقش محراب دار آبنوسی الماریوں میں سنہری اور روپہلی کامدار جلدوں میں ہزاروں نادر مخطوطات اور نایاب کتب کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست کے مصداق زینتِ نگاہ تھیں، اس کمسن متجسس طالبِ علم کے لیے بحرِ طلسمات سے کم نہ تھا۔ روایت و درایت اور اجتہاد کے سنگم کا یہ راہی برسوں مختلف النوع نظریات کی بھول بھلیوں میں سفر کرتا رہا، یہاں تک آخرکار وہ نصف النہارِ جوانی میں بائیں بازو کے دانشور کے روپ میں ظاہر ہوا۔ اس نظریاتی وابستگی کے باوجود ان سطور کے قارئین کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ "آدرش" کا مصنف بہرحال اس منافقت بردوش اور ریا در آغوش معاشرے کا فرد ہے جہاں قدم قدم پر استحصالی قوتیں حق طلبی کی راہ میں مزاحم ہیں اگرچہ اس دار و گیر میں وہ یقیناً طالبانِ حق کی طرف ہے، لیکن بایں ہمہ میں سرنامے کا

شعر پھر دہرتا ہوں:

اگر درویش بر حالے بماندے

سرِ دست از دو عالم بر فشاندے

زیر نظر کتاب آدرش مسلم شمیم صاحب کی ان تحریروں پر مشتمل کتاب ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً کراچی سے شائع ہونے والے معروف ادبی مجلے طلوعِ افکار کے لیے بطورِ اداریہ لکھیں۔ یہ اداریے موضوعات کے اعتبار سے پانچ ابواب میں منقسم ہیں۔

پہلے اور دوسرے ابواب میں فکری موضوعات پر گفتگو ہے اور مصنف نے اپنے زاویۂ نظر سے گزشتہ ربع صدی میں ہونے والے بعض اہم واقعات اور بعض ادبی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ تیسرے باب میں سات مضامین شامل ہیں اور یہ نظریاتی کم اور فکری زیادہ ہیں۔ اس میں ایک شخصیت اور ایک تصنیف بھی زیرِ بحث ہے۔ چوتھا باب اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس باب میں مصنف نے اپنے عہد کی بارہ مختلف النوع اور مختلف النظریات ادبی شخصیات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان میں بعض شخصیات اپنے ادبی کارناموں اور نظریات کے اعتبار سے اہم اور متنازع فیہ ہیں۔ یہ باب مصنف کے ادبی و شعری رویے اور اس کے انسان دوستی کے مسلک کی نشاندہی کرتا ہے۔ پانچواں اور آخری باب اظہارِ ذات کا ہے اور اس باب میں مصنف نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنے ادبی و شعری نظریات پر گفتگو کی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا پہلا اداریہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا اور آخری اداریہ اپریل ۱۹۹۹ء کے شمارے میں چھپا۔ اس طرح یہ اداریے ۱۱ سال کے ملکی اور بین الاقوامی سیاسی و ادبی منظر نامے کی متحرک تصویریں ہیں اور بیشتر تحریریں آتش زیرِ پا مسائل

پر لکھی گئی ہیں ۔ ان اداریوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بعض کو معاصر مجلات نے اپنے یہاں خصوصی طور پر نقل کیا ۔ ان اداریوں کی خیال آفرینی کی بنا پر ان پر مختلف مکتبہ ہائے فکر کے صاحبانِ قلم نے اظہارِ خیال بھی فرمایا اس لیے کتابی صورت میں ان اداریوں کی جمع آوری ضروری سمجھی گئی

مسلم شمیم صاحب میرے نہایت مخلص دوست ہیں ۔ "طلوعِ افکار" کی رفاقت میں ہماری ہمسفری کو ۱۲ سال سے کچھ اوپر ہو چکے ہیں ۔ میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے جلوت و خلوت دونوں میں ۔ وہ شعر و ادب کے شیدائی اور یارِ اربابِ شناسائی ہیں اور ہم دونوں پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے:

در خراباتِ طریقت ما بہم منزل شویم
کایں چنیں رفتست در عہدِ ازل تقدیرِ ما

میں نے چار مصرعے اپنے دوست کی شگفتگیٔ طبع کی خاطر عرض کیے ہیں، آپ بھی محظوظ ہوں:

مسلم شمیم قند بیاں ، نیشکر رقم
لکھتے رہے جنوں کی حکایات بیش و کم
اربابِ فنِ نقد جنھیں پڑھ کے دوستو!
چومیں گے بڑھ کے صاحبِ آدرش کا قلم

حسین انجم
(مدیر طلوعِ افکار، کراچی)

# ادب اور نظریہ

# آدرش

اس جریدے نے اپنے سفر کے اٹھارہ سال مکمل کر لیے ہیں ۔ یہ سفر جن
نامساعد حالات میں طے ہوا اور نشیب و فراز کے جن مراحل اور مشکلات سے دوچار ہوا
ان کے اظہار کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ، بلکہ ہم اپنے قارئین کو یہ خوش خبری دینا چاہتے
ہیں کہ یہ جریدہ نئے سال کے آغاز سے اپنے خوب سے خوب تر کے سفر کی ابتدا کرنے جا
رہا ہے ۔ اس مرحلے میں ہمیں چند نئے رفیقان سفر کا عملی تعاون حاصل ہوا ہے ۔ اس
نئے سفر کی راہیں اور سمت ہم نے متعین کرنی ہیں ۔

ہماری ترجیحات ادب سے شروع ہو کر ادب پر اختتام پذیر ہوں گی ۔ اس سے
ہماری مراد ادب کی خود مختاری (autonomy of literature) کے نظریے کی
ترویج نہیں بلکہ ادب اور زندگی اور ادب اور سماج کے رشتوں کو نئی وسعتوں اور نئے
امکانات سے ہم کنار کرنے کے عزم کا اظہار ہے اور ادب کے سماجی کردار اور منصب کو
زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی آرزو کا اعادہ ہے ۔ ہمارے نزدیک ادب سماجی تبدیلی کا
موثر ذریعہ ہے اور صرف کمٹمنٹ (commitment) ہی ہمارے وجود کو انسان اور
ادب کی حیثیت سے مستند کرتا ہے ۔ فنی تخلیق اگر زندگی کے مسائل اور احترام سے

مبرا ہو اور ایسے تصورات کی اشاعت کرے جو انسانی فلاح اور ترقی کے دروازے بند کر دے تو وہ زندگی اور فن کی اعلیٰ قدروں سے عاری اور بے مقصد ہوتی ہے۔ سماجی شعور سے عاری ادب اور فنون لطیفہ کے تمام تصورات نہ صرف غیر ذمے دارانہ ہیں بلکہ ایسے تمام رجحانات اور تصورات انسانی تمدن اور تاریخ کی غلط تاویل کا نتیجہ ہیں۔ ادیب، دانش ور اور فن کار معاشرے کا ضمیر اور سماج کے زیادہ حساس اور باشعور عناصر ہوتے ہیں، اس لیے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے معاشرے اور عام انسانی سماج کی بہتری اور ترقی میں مدد دینا ہمارا ایک سماجی اور اخلاقی فرض ہے۔

ہم قنوطیت، انفعالیت، قدامت پرستی، مقدر پرستی اور زندگی کو فریب محض سمجھنے کے تصورات کو ادب کے لیے پیغام مرگ سمجھتے ہیں۔ ادب کی زندگی کو تابندہ تر بنانے کے لیے ان کی نفی کرنا ہماری ایک اہم ذمے داری بنتی ہے۔ ابلاغ سے محروم نام نہاد تخلیقات خود ادب کو بے معنویت اور لایعنیت کا شکار کرتی رہی ہیں۔

انسانیت سے محبت اور انسانوں کے درمیان اخوت و مہر کے پاکیزہ جذبات کو فروغ دینا انسانی معاشرے کی ہمہ جہت ترقی اور خوش حالی کے لیے ناگزیر ہے۔ فرقہ واریت، تنگ نظری اور منافرت کے جذبات شرف انسانیت سے مطابقت نہیں رکھتے لہٰذا ایسی تخلیقات جن میں یہ منفی فکر کار فرما ہوگی، وہ ہمارے معیار کے دائرے سے باہر ہی رہیں گی۔

انسان کی بقا اور ترقی کا انحصار عالمی امن پر ہے، اور علم و ادب اور فکر و فن کے پودے جنگ کے زہریلے ماحول میں بار آور نہیں ہو سکتے۔ ادب، آرٹ اور وہ سب کچھ جو مقدس، خوب صورت اور بامعنی ہے، اس کی تخلیق امن اور آزادی کے ماحول میں ہی ممکن ہے۔ زندگی اور موت، امن اور جنگ، نیکی اور بدی اور ایٹم بم اور پھولوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں ادب اور آرٹ نے ہمیشہ زندگی، امن، نیکی اور پھولوں کا ساتھ دیا ہے۔ لورکا، نرودا، فیض اور محمود درویش کی نظمیں ہمیشہ بندوق کے

سامنے سینہ سپر رہی ہیں ، ادب اور آرٹ کا یہی ایک ہی راستہ ہے ۔ نظمیں اور کتابیں آگ اور خون کے سمندر میں ڈوب کر پار اترتی ہیں اور امن کے پھول کھلاتی ہیں ۔

نظریاتی سطح پر بنیاد پرستی اور توہم پرستی کی جگہ روشن خیالی ، خرد افروزی ، تعقل پسندی ، رواداری اور سائنسی فکر کے تصورات اور آدرش کو آگے بڑھانے میں اپنی بساط بھر سعی مشکور کرنا ہم اپنا خوش گوار فریضہ تصور کرتے ہیں ۔ ہمارے ادب کی ترقی کی راہ میں حائل دو طرح کے رجحانات ، اول وہ رجحانات جو پرانے نظام معیشت کی پس ماندگی کا نتیجہ ہیں ، دوم وہ رجحانات جو مغربی استعمار کے آوردہ اور پروردہ ہیں ؛ مثلاً : عصبیت پرستی ، سریت ، حیوانیت ، فحش نگاری ، جنسی انتشار پسندی ، ابہام پسندی اور رہبانیت کے رجحانات ۔ ان خطرناک رجحانات کو بے نقاب نہ کرنے اور زندگی کی توانا قدروں کو آگے نہ بڑھانے کے نتیجے میں ہمارا ادب بے جان ہو کر رہ جائے گا ۔ ہمارا مسلک صحت مند اور زندہ ادب کا فروغ ہے .... ایسا ادب جو دل کی گہرائیوں سے نکلے اور فن کے معیارِ جمال پر پورا اترے ، ایسا ادب جو حسن و محبت کی نغمگی ، عشق و یقین کے سوز اور حق و صداقت کے خلوص سے لب ریز ہو ، ایسا ادب جو زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو جو لوگوں کو جگائے ، آگے بڑھائے ، تسکین دے اور خوش کرے ۔

ان معروضات کی روشنی میں ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ جنوری ، ۸۸ء سے یہ جریدہ اپنے نئے قالب اور تازہ تر تخلیقات کے ساتھ ہر ماہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا ۔ آپ کی پسندیدگی ، حوصلہ افزائی اور سرپرستی ہمارے لیے قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھیں گی ۔

# سوویت یونین کے انہدام کے بعد

" ادب میں ارتقا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی سچا (genuine) ادیب شعوری طور پر اپنے ارد گرد ہونے والی تبدیلیوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، اس طرح ہر دور میں سچے اور کھرے قلم کاروں کا تخلیق کردہ ادب اس دور کی پہچان ہوتا ہے۔ اپنے عہد میں ہم اگرچہ اس بات پر دست و گریباں بھی رہے ہیں کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیے یا ادب برائے زندگی، مگر حقیقت یہ ہے کہ بوجوہ ادب برائے زندگی کی تحریک سے اختلاف کرنے والوں میں بھی جو صحیح معنوں میں قلم کار تھے، انھوں نے بدلتے ہوئے حالات کا ادراک کیا اور اپنی تخلیقات میں اس کا اظہار کیا"۔

مندرجۂ بالا سطور انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ اینڈ لٹریچر، لندن کے اس مراسلے کا ابتدائیہ ہیں جس کے ذریعے انسٹی ٹیوٹ کے بانی جناب عاشور کاظمی نے " صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے " کے مصداق اہل فکر و دانش کو دعوتِ غور و فکر دی ہے جس کا مکمل متن ہم نے اپنے گزشتہ شمارے میں شائع کیا تھا اور جو

چند دیگر معاصر جریدوں میں بھی شائع ہوا ہے۔

مراسلے میں کہا گیا ہے:

"ہماری چھوٹی سی دنیا میں پچھلے دنوں تک دو واضح طاقتیں تھیں جو پوری دنیا کو اپنے زیرِ نگیں دیکھنا چاہتی تھیں جس سے ہر ذی فہم پر دو اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ایک تکلیف دہ پہلو تو یہ تھا کہ ہر وقت ایک بھیانک جنگ کا خطرہ منڈلاتا رہتا تھا اور ہر صاحبِ فہم ایک اعصاب شکن تناؤ کا شکار رہتا تھا، اور اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ دنیا میں ایک check and balance کا نظام خود بخود قائم ہو گیا تھا"۔

اس مراسلے میں آگے چل کر کہا گیا:

"آج کا عام انسان خوش ہے کہ سرد جنگ ختم ہو گئی، اسلحے کی دوڑ ختم ہو گئی، نوآبادیاتی نظام ختم ہو گیا، مگر اب یہ دانش وروں کو سوچنا ہے اور دنیا کو سمجھانا ہے کہ کیا واقعی اسلحے کی دوڑ ختم ہو گئی ملکوں میں اسلحہ سازی بند ہو گئی ہے جن کی معیشت کا دارومدار اسلحہ سازی پر ہے"۔

غرض یہ کہ نئی عالمی صورتِ حال جو سوویت یونین کے انہدام اور اشتراکی نظام کی شکست و ریخت کے نتیجے میں پیدا ہوئی، یہ مراسلہ اس پر سنجیدگی سے فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

یہ کہنا کہ آج ہم ایک نئی دنیا میں جی رہے ہیں، کچھ زیادہ درست بات نہ ہو گی، مگر آج کی دنیا کا منظرنامہ بہت مختلف ہے، اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد دنیا کو جس تشکیلِ نو کی ضرورت درپیش ہوئی تھی، challenges کا سامنا ہوا تھا، عالمی نقشہ تغیر و تبدل

سے دوچار ہوا تھا۔ اقتصادی، سماجی، سیاسی، اخلاقی اور نفسیاتی زندگی نئے رجحانات، رویوں، نظریوں اور مسائل و مشکلات سے دوچار ہوئی تھی، آج ان سب عوامل کے علاوہ کچھ نئے مسائل اور گتھیاں ہمارے سامنے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں میں ایک information revolution آیا اور اب پوری دنیا الیکٹرانک میڈیا کی بدولت واقعی بہت مختصر ہو گئی ہے، سمٹ گئی ہے۔ اب خواب گاہوں میں اطلاعات کی فراہمی ممکن ہو گئی، یعنی ہمیں اپنے بیڈ روم میں بھی دنیا کی تازہ ترین صورتِ حال سے باخبری حاصل ہو گئی ہے۔ کمپیوٹر کے نظام نے اطلاعات کی فراہمی میں جو تیز رفتاری پیدا کر دی ہے اور اس میں جامعیت اور تیقن کے عناصر شامل ہو گئے ہیں، یہ کچھ ماضیِ بعید میں انسانوں کو میسر نہ تھا۔ سائنسی، تکنیکی انقلاب، یعنی Scientific and Technological Revolution نے ایک ایسی انقلابی صورتِ حال پیدا کر دی ہے جو ہمہ اوقات تیز تر تبدیلی کی علم بردار ہے، چنانچہ نظریات و افکار کی دنیا میں ایک بحران کا سماں نظر آرہا ہے، تبدیلی اور ترقی کی رفتار اور نوعیت پر گرفت مشکل تر ہو گئی ہے۔ سوویت یونین کے انہدام اور اشتراکی نظام کی شکست و ریخت کے نتیجے میں مغربی دنیا، یعنی سرمایہ دار دنیا میں جو جوش و جشن نظر آنا چاہیے تھا وہ تقریباً معدوم ہے۔ امریکی صدارتی انتخابات میں جو صورتِ حال درپیش ہے، وہ سرمایہ دارانہ نظام کے بحران کی بھی غمازی کرتی ہے۔ عام حالات میں صدر بش کو سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں ایک قومی ہیرو کا درجہ حاصل ہونا چاہیے تھا اور انتخابات میں ان کو کسی challenge کے بجائے walk over ملنا چاہیے تھا مگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ نئے عالمی نظام کا محرک امریکا اقتصادی ابتری میں مبتلا ہو کر نام نہاد سپرپاور بننے کی سمت گام زن نظر آتا ہے۔ فوجی برتری بغیر اقتصادی برتری کے کتنے دنوں تک قائم رہ سکتی ہے، یہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ کا اقتصادی دیوالیہ پن اس کے زوال اور برطانوی

نوآبادیاتی شکست و ریخت پر منتج ہوا۔ امریکا چونکہ دوسری جنگ کے خاتمے پر سب سے بڑا beneficiary ملک تھا اور اقتصادی طور پر اسے سب پر بالادستی حاصل ہو گئی تھی، چنانچہ امریکا نوآبادیاتی نظام کی جگہ جدید نوآبادیاتی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور اسے جلد ہی دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایک سپر پاور کی حیثیت حاصل ہو گئی امریکا اب اقتصادی بالادستی سے محروم ہو چکا ہے۔ امریکی معیشت ایک بیمار معیشت بن چکی ہے۔ اس کے برعکس دوسری جنگِ عظیم میں شکست سے دوچار ہونے اور سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ممالک، یعنی جاپان اور جرمنی نے اقتصادی شعبے میں ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان ممالک کی اقتصادی توانائی اور استحکام کے سامنے امریکی بیمار معیشت کہاں کھڑی ہو سکتی ہے اور اس کی فوجی برتری کو کب تک سہارا دے سکتی ہے، یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ جرمنی اور جاپان کے ساتھ فرانس اور چند دوسرے یورپی ممالک اور مشرق بعید کی کچھ ریاستیں بھی اپنی اقتصادی توانائی اور استحکام کے باوصف نئے عالمی نظام کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے کے اہل بن جائیں گے۔

ان تبدیلیوں کے تناظر میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلطی نہ ہو گی کہ سوشلسٹ نظام کا بحران اور انتشار کوئی یک طرفہ معاملہ نہیں ہے۔ سوویت یونین کے انہدام نے ساری دنیا کو ایک بھونچال میں ڈال دیا ہے۔ سرمایہ دار دنیا کو بھی سنگین بحران کا سامنا ہے۔ نظریاتی شکست و ریخت کا عمل کسی خاص گوشے اور شعبے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی لپیٹ میں کرۂ ارض کا ہر خطہ اور ہر مکتبۂ فکر ہے، مگر یہ انتشار و بحران ماضی کے نظریاتی بحران و انتشار سے بہت مختلف ہے۔ اس کا صحیح ادراک اور شعور دراصل آج کے دانش وروں اور قلم کاروں کے لیے سب سے بڑا challenge اور وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا غیر ضروری نہ ہو گا کہ انسانی شعور کا یہ جاری سفر پسپائی کا سفر نہیں ہے، بلکہ انسانی شعور کا یہ سفر

پیش رفت کا سفر ہے ۔ انسانی تاریخ کا یہ دھارا ترقیِ معکوس سے نبرد آزما نہیں ہے بلکہ قانون اور ارتقا کے تقاضوں کو آج بھی پورا کر رہا ہے اور روشن تر مستقبل کی راہیں ہموار تر کر رہا ہے ۔ نظریاتی شکست و ریخت کے عمل کے نتیجے میں نظریات معدوم نہیں بلکہ نئے نظریات جنم لے رہے ہیں ۔ وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو تحریک اور نظام ، راسخ العقیدگی اور عقیدہ پرستی (obscurantism & dogmatic) سے وابستہ ہو گا ، وہ شکست و ریخت سے دوچار ہو جائے گا ۔ اس قانون ارتقا سے کسی کو مفر نہیں ہے ۔ صرف سائنسی اصلاحات کا ورد اور تسبیح خوانی کافی نہیں ہے ، بلکہ ہمہ وقت تبدیلی اور تغیر کی لہروں کا صحیح ادراک کرتے رہنے اور اس کی روشنی میں خود کو بدلتے رہنے میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے ۔ اس کا اطلاق معاشرے پر بھی ہوتا ہے اور نظامِ معاشرہ اور نظریات و افکار پر بھی ۔

جناب عاشور کاظمی کے زیرِ نظر مراسلے کا لب لباب انھی خطوط پر ہم عصر زندگی اور معاشرے کے مطالعے کی دعوت ہے ۔ لندن میں دسمبر ، ۱۹۹۲ء میں ان کی مجوزہ کانفرنس کے انعقاد اور کامیابی کے لیے ہم اپنی نیک تمناؤں کا اظہار بھی کرتے ہیں اور اپنے تعاون کی یقین دہانی بھی کراتے ہیں ۔ ہم اپنے قارئین کو دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں کہ وہ اس باب میں اپنی رائے اور تجاویز ہمیں یا براہِ راست مجوزہ کانفرنس کے محرک کو ارسال فرمائیں ۔ اس کانفرنس کا انعقاد ہمیں ۱۹۳۵ء میں کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی اس کانگرس کی یاد دلا رہا ہے جو پیرس میں منعقد ہوئی تھی ۔ اس وقت کے شہرۂ آفاق ادیبوں کی اس کانفرنس نے یہ طے کیا کہ ادیب و شاعر کو اپنے نہاں خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے رجعت پسند قوتوں کے مدِمقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے ۔ اس حوالے سے لندن میں مجوزہ کانفرنس کی اہمیت اور افادیت ہمارے نقطۂ نظر سے واضح ہو جاتی ہے ، لہٰذا آج کے

ادیبوں اور دانش وروں کو اس کانفرنس کے سلسلے میں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہونا چاہیے اور اس ضمن میں اپنے تعاون اشتراک پیش نہ کرنے میں کسی بخل اور جھجک سے کام نہیں لینا چاہیے۔

جولائی، ۱۹۹۲ء

# جنتِ گم گشتہ

دیکھا عجیب ربط عناصر کے درمیاں
بدلا جو آسماں تو سمندر ہی اور تھا
(مظہر جمیل)

انقلابِ اکتوبر کی سرزمین روس میں جو سوویت معاشرہ گزشتہ سات دہائیوں میں قائم ہوا تھا، اس کا انہدام جس تیزی اور جس پیمانے پر ہو رہا ہے، اس کا مشاہدہ کرنے کے مجھے مرحلے وار مواقع میسر آئے ہیں۔ گزشتہ قیامِ ماسکو (۲۷ جون تا ۱۰ جولائی، ۹۲ء) کے دوران جو نقش خاص طور پر میرے ذہن کے پردے پر ابھرا، اس کا تعلق وہاں کے علم و ادب کے افق پر نمودار ہونے والے دھندلکوں سے ہے۔ سوویت معاشرے کا زوال اور اس کی شکست و ریخت کا سب سے بھیانک پہلو وہاں کے علم و ادب کے شعبے میں نظر آتا ہے۔ وہ معاشرہ جہاں علم و ادب کا بول بالا تھا اور دانش کدوں اور درس گاہوں کو بڑی عظمتیں حاصل تھیں، جہاں دنیا میں سب سے زیادہ شرحِ تعلیم تھی، اب اس روسی معاشرے کی صورتِ حال بالکل برعکس ہے۔ صد فی صد شرحِ تعلیم رکھنے والے معاشرے میں علم و ادب کی بے توقیری ہو رہی ہے

اساتذہ اقتصادی طور پر کسمپرسی کے عالم میں ہیں اور بیشتر اشاعت گھر بند ہو چکے ہیں جہاں کتابیں رسائل اور جرائد لاکھوں کی تعداد میں چھپتے تھے ، اب ہزاروں کی تعداد میں چھپنے لگے ہیں ۔ سنجیدہ تحریریں بے مایہ تصور کی جارہی ہیں اور اب ایڈونچر اور جنسی خرافات سے بھرپور کتابیں اور جریدے چھپنے اور پڑھے جانے لگے ہیں ۔ نوجوان نسل تعلیم کی طرف سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہے اور درس گاہوں کے بجائے ان کا رخ کوچہ و بازار کی طرف ہے ۔ چھوٹے چھوٹے بچے سڑکوں پر فکر معاش میں سرگرداں ہیں اور گاڑیاں صاف کرنے سے لے کر ہر قسم کی خردہ فروشی کرکے پیسہ کمانے میں مصروف ہوگئے ہیں ۔ نت نئے معاشی مسائل کی بنا پر ایک نیا کلچر ابھر رہا ہے .... چیونگم ، چاکلیٹ اور کوکا کولا کلچر ۔ اس کلچر کے تقاضے نئی نسل کو تاریک راہوں کی طرف لے جارہے ہیں ۔ وہاں کی بیشتر آبادیاں قومی تفاخر کے جذبے سے عاری ہوتی جارہی ہیں ۔ اپنے ملک کی اشیا سے روگردانی کرکے مغربی ممالک اور مشرق بعید کے ممالک کی اشیا کا اس معاشرے میں craze نظر آتا ہے ۔ ماسکو چند برسوں میں کچھ سے کچھ ہوگیا ہے ۔ سارے شہر کے سیکڑوں میٹرو اسٹیشنوں کے باہر بازار لگ گئے ہیں جہاں ٹھیلوں اور خونچوں پر اشیائے صرف فروخت کی جاتی ہیں ۔ شہر کے گوشے گوشے میں فٹ پاتھوں پر کیبنوں کی شکل میں چھوٹی چھوٹی دکانیں کھل گئی ہیں جو تقریباً چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہیں جہاں شراب اور دیگر مشروبات کے علاوہ سگریٹ ، چاکلیٹ ، چیونگم اور دیگر تعیشات کی اشیا بکتی ہیں جو تمام تر بیرونی ممالک کی ہوتی ہیں ۔

روسی معاشرہ ایک ایسے بحران سے دوچار ہے جس کی سنگین نوعیت کو فقط لفظ بحران سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ۔ روسی معاشرہ ایک طرف ان تمام اقدار سے محروم ہوتا ہوا نظر آرہا ہے جو اس کا عظیم ورثہ تھیں ۔ سوویت نظام نے ان کی زندگی کو ایک مشن اور آدرش سے روشناس کردیا تھا اور وہاں کے بیشتر لوگ کچھ عرصے قبل

تک معاشرے کے اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لیے سرگرداں نظر آتے تھے، یہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے عوام کی جانب اپنا دستِ تعاون بڑھانے میں پیش پیش تھے اب حال یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کے خول میں سمٹتا جارہا ہے اور اپنی زندگی کو اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے وقف کرنے پر تلا ہوا نظر آتا ہے۔ اب اپنی ذات اس کی کائنات ہے اور اس کائنات کی منزل مقصود اشیائے تعیش کا حصول ہے۔ مغربی دنیا سے انھوں نے اگر کچھ سیکھا ہے تو وہ consumerism ہے۔ انھوں نے مغربی دنیا کی برائیاں تھوک کے حساب سے حاصل کرلی ہیں اور اچھائیوں کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیا ہے۔ اپنی تمام تر مثبت تہذیبی قدروں کی طرف سے انحراف کرنا ان کا ہدف بن گیا ہے۔

انقلابِ اکتوبر اور سوویت نظام کے انہدام اور شکست و ریخت پر ساری دنیا میں گزشتہ کئی برسوں میں سنجیدگی سے غور و فکر ہو رہا ہے، مذاکرے اور سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں، مگر تعجب خیز بات یہ ہے کہ اگر ان موضوعات پر سب سے کم کہیں توجہ دی گئی ہے تو یہ وہ ملک ہے جہاں یہ سب کچھ چشم زدن میں رونما ہوا ہے دوسال قبل جب میرا وہاں جانا ہوا تھا اور میں نے وہاں کے لوگوں کے چہروں کا مشاہدہ کیا تھا تو میں نے یہ تاثر قبول کیا تھا کہ وہاں کے لوگ سکتے کے عالم (state of shock) میں ہیں، مگر اس مرتبہ میرا یہ تاثر قطعی زائل ہوگیا اور مجھے اب ایسا محسوس ہورہا ہے کہ

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

مجھے کچھ ایسا لگا کہ جیسے وہاں کے لوگ اس بے توقیری (disgrace) کو محسوس ہی نہیں کررہے ہیں جو آج ان کا مقدر بن چکی ہے۔ دنیا کا دوسرا super power ملک آج تیسری دنیا کا ملک بن گیا ہے۔ ایک ڈالر روس کے

گیارہ سو روبل کے برابر ہے اور اب تک وہاں پچاس ہزار روبل کا نوٹ بازار میں آچکا ہے اور ایک لاکھ روبل کے نوٹ کے جلد آمد کی خبر گرم ہے۔ جو معاشرہ بہت سی سماجی برائیوں سے قطعی ناآشنا تھا، آج ہر قسم کے سماجی جرائم کی لپیٹ میں ہے۔ کرپشن وہاں کے معاشرے کا ضابطۂ اخلاق (code of ethics) بن گیا ہے۔ وہاں کے ادیب و دانش ور اپنے معاشرے کی اس صورتِ حال سے اس درجہ متاثر ہیں کہ ان کے پاس کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ سوویت معاشرے کی شکست و ریخت سے زیادہ انھیں اپنے معاشرے میں علم و ادب کی تنزلی کا دکھ ہے جو سوویت نظام کے انہدام کے منطقی نتیجے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ کچھ ایسے بھی قلم کار ہیں جو انفرادی آزادی کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں اور تمام تر فلاکت زدگی اور تہی دستی کے باوجود آزادی کو ہر قیمت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سوویت نظام نے ایک پابند معاشرہ تشکیل دیا تھا جس نے ہمارے معاشرے کے ذہین ترین لوگوں سے بھی سوچنے کی صلاحیت چھین لی تھی، چنانچہ تخلیقی عمل وقت کے ساتھ بے معنی اور بے وقعت ہوتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ بیشتر لوگ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہوتے چلے گئے۔ سوویت نظام کے انہدام کے نتیجے میں پہلی بار بقول ان کے روسی شہری اپنے مسائل اور اپنے گرد و پیش کے حوالے سے سوچنے کے اہل ہوئے ہیں۔ انسان کو اگر سوچنے سے محروم کر دیا جائے تو پھر شرفِ انسانیت کی کون سی اساس قائم رہے گی؟ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ گزشتہ چند برسوں سے یہاں کے ادیبوں نے کوئی سنجیدہ ادب تخلیق ہی نہیں کیا۔ کم از کم ان کی تخلیقات کتابوں اور جریدوں میں نظر نہیں آتی ہیں۔ بیشتر لوگ صورتِ حال سے بد دل بھی ہیں اور مایوس بھی۔ روسی سائنس داں اور اساتذہ جنھیں مواقع میسر آرہے ہیں، وہ ملک سے باہر روزگار کی تلاش میں نکل رہے ہیں اور خاصا brain drain اب تک ہو چکا ہے۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ اپنی ملازمتیں ترک کر کے خود ملک میں نئے اداروں سے وابستہ ہو رہے

ہیں جہاں کچھ زیادہ تنخواہ ملتی ہو۔ ایک تجارتی ادارے میں دو اساتذہ، جن میں سے ایک فلسفے کے پروفیسر تھے، چپراسی کا کام کر رہے ہیں اور ایسی بہت سی مثالیں اور بھی ہیں۔ گزشتہ دنوں ماسکو اسٹیٹ یونی ورسٹی، جو ملک کی ایک فقید المثال درس گاہ ہے، کے اساتذہ نے یونی ورسٹی کے احاطے میں تعلیم اور سائنس کے تحفظ کے لیے مظاہرہ کیا۔ انھوں نے اپنے بینرز (banners) پر جو نعرے لکھے تھے، ان کا مرکزی خیال تعلیم اور سائنس کے حوالے سے تھا۔ ماسکو کے ایک عظیم تحقیقی ادارے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز (Institute of Oriental Studies) سے وابستہ نام ور ترین محققین اور اہل دانش اس ادارے کے مستقبل کی طرف سے کچھ زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ اس ادارے نے اب تک پاکستان سمیت تیسری دنیا کے ممالک کے علم و ادب و ثقافت پر جو کام کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے اور اس نوعیت اور اس پیمانے پر خود متعلقہ ممالک میں کام نہیں ہوا ہے۔ اس جیسے ادارے کے مستقبل کے بارے میں غیر یقینیت دنیا کے تمام اہل علم و دانش کے لیے یکساں تشویش کی بات ہے۔

اب تک کے سفر کے ماحصل کو چند لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس معاشرے نے "صرف کھویا ہے، کچھ پایا نہیں"۔ جمہوریت جس کی خاطر اشتراکی معاشرے کو شکست و ریخت سے دوچار ہونا پڑا، وہ کہیں دور دور نظر نہیں آتی آزادیٔ اظہار بھی آزادیٔ موہوم سے زیادہ نہیں ہے، کیونکہ ذرائع ابلاغ پر منظم گروہوں کا قبضہ ہے یا ان پر موجودہ establishment کا تسلط ہے۔ شخصی آزادی کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں مگر کس قیمت پر، یہ غور طلب نکتہ ہے۔ وہاں کے صاحبانِ دانش اور قلم کاروں کا ردِ عمل ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔ انتہائی تاسف کی بات ہے کہ الیگزنڈر پشکن، نکولائی گوگل، ترگینیوو، تالستائی، چیخوف، میکسم گورکی، میخائیل شولوخوف اور بورس پیسترناک جیسی روسی شعر و ادب کی عالمی

شہرت یافتہ قدآور شخصیتوں کا گہوارہ اور طب، سائنس اور ٹکنالوجی کے بعض شعبوں میں مغربی دنیا پر سبقت لے جانے والی سرزمین اور تیسری دنیا کو معاشی، صنعتی اور سیاسی غلامی کے خلاف تحفظ فراہم کرنے والا ملک جہل کی تیرگی کی طرف گام زن نظر آرہا ہے۔

مئی، ۱۹۹۳ء

# آفتابِ تازہ

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اپریل کا مہینہ ذکرِ اقبال کا مہینہ ہے۔ یہ فکرِ اقبال پر نئے عالمی تناظر میں تفکر کرنے کا محل اور موقع ہے اور نظریاتِ اقبال کا نئے زاویوں سے مطالعے کرنے کا موزوں ترین مرحلہ ہے، اور اس مطالعے کے ذریعے ہم عصر معاشرتی زندگی کو درپیش مسائل و مشکلات کی تفہیم کی سنجیدہ کوشش کرنے کی گھڑی ہے۔ جہاں اقبال کو ازسرِ نو دریافت کرنے کی ضرورت ہے، وہاں ایسے جزیروں اور خطوں کی کمی نہیں جہاں زندگی کی معنویت کے نت نئے منظرنامے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ وقت روحِ اقبال میں نئی بصیرت اور بینائی کے ساتھ جھانک کر اس کی گہرائی و گیرائی کا جائزہ لینے اور وہاں روحِ ہم عصر کے کرب کا مداوا ڈھونڈنے کا متقاضی ہے۔ اقبال شناسی کے سفر میں نئی جہتوں اور سمتوں کا پتا لگانا آج ایک ایسا فریضہ بن گیا ہے جس سے روگردانی کرنے کا ہم تصور نہیں کر سکتے، کیونکہ سماجی زندگی نظریاتی شکست و ریخت سے دوچار ہو کر بے سمتی کا شکار ہونے

کے خطرات میں گھری ہوئی ہے ۔ ہمارے سامنے ایک گردابِ بلا ہے جس سے کشتیِ حیات کو بحفاظت گزارنا کوئی آسان بات نہیں ہے ۔ اس دشوار تر عرصۂ سفر میں ناخدائی اور رہ نمائی حاصل کرنے کے لیے اقبالیات سے استفادہ کرنا ناگزیر بن چکا ہے ۔

سرِ عبارت علامہ اقبال کا شعر روس میں برپا ہونے والے انسانی تاریخ کے سب سے بڑے انقلاب ، یعنی انقلابِ اکتوبر ، ۱۹۱۷ء کے سیاق و سباق سے تعلق رکھتا ہے جس میں علامہ اقبال کی طرف سے اس انقلاب کے لیے پرجوش جذبۂ پذیرائی کا اظہار ملتا ہے ۔ بقول مرحوم سبطِ حسن :

> " علامہ اقبال نے انقلابِ اکتوبر اور اس انقلاب کے محرکین و محرکات کے حوالے سے جو توانا اور عظیم نظمیں کہی ہیں ، ان سے بہتر نظمیں تو درکنار ان کے پائے کی نظمیں بھی کسی بعد کے آنے والے ترقی پسند شاعر نے نہیں لکھیں ۔ علامہ کی ان نظموں میں پائی جانے والی وسعت ، گہرائی و گیرائی اور ان کے آفاقی تناظر کو فقید المثال ہی کہا جا سکتا ہے " ۔

علامہ اقبال کی نگارشات اور تحریریں گزشتہ چار دہائیوں میں انقلابِ اکتوبر کی سرزمین سابق سوویت یونین کی مختلف زبانوں میں منتقل ہوتی رہی ہیں اور ان پر خاصا کام بھی ہوا ہے ۔ یہاں کچھ ایسے ادیب بھی ہیں جن کی پہچان اقبال شناسی کے حوالے سے کی جاتی ہے ۔ حال میں میرا ماسکو جانا ہوا اور اپنے قیام ماسکو کے دوران یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہاں اقبال شناسی کے باب میں نئی جہتیں اور سمتیں تلاش کرنے کی ازسرِ نو منصوبہ بندی کی گئی ہے ۔ اکتوبر ، ۱۹۹۱ء میں ماسکو میں اقبال سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کے صدر روس میں اردو کے سب سے بڑے مستشرق پروفیسر سخاچوف ہیں اور دیگر عہدے داروں میں بھی بڑے معتبر نام شامل ہیں ۔

یوں ۱۷ اپریل ، ۱۹۹۲ء میں ماسکو میں پہلی مرتبہ بڑے وسیع پیمانے پر یوم اقبال کی تقریبات منعقد کی گئیں ۔ یوم اقبال کی یہ تقریبات روس پاک دوستی اور اقبال سوسائٹی کی مشترکہ کوششوں اور ان اداروں کے زیرِاہتمام منعقد ہوئیں ۔ اختتامی اجلاس میں یہ طے پایا کہ اب سے ہر سال یوم اقبال وسیع انتظام و انصرام سے منایا جائے گا ، اور مستقبل قریب میں اقبال کی شخصیت و فکر و فن پر مشتمل کتابوں کا ایک بین الاقوامی سیریل شائع کیا جائے گا جس میں اب تک دنیا کی تمام زبانوں میں جو کچھ علامہ اقبال پر کام ہوا ہے ، شامل ہو گا ، اور یہ بین الاقوامی کتاب سلسلہ کئی عالمی زبانوں میں شائع ہو گا ۔ یہ انکشاف روس کے انتہائی معتبر دانش ور و قلم کار پروفیسر سخاچوف و پروفیسر گانگو فلسی نے دوران ملاقات کیا تھا اور مذکورۂ بالا یوم اقبال کی تقریبات کی تفصیلات سے بھی آگاہ فرمایا تھا ۔ زبان اردو سے وابستگی رکھنے والوں کے لیے عموی طور پر اور اہل پاکستان کے لیے خصوصی طور پر یہ خبر یقیناً بڑی طمانیت کا باعث ہونا چاہیے کہ روس میں پہلی بار اقبال شناسی کی اتنے وسیع پیمانے پر کوششیں کی جا رہی ہیں ۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس سوویت یونین کے لیے علامہ اقبال نے مختلف موضوعات کے حوالے سے فقید المثال نظمیں لکھیں ، اس سوویت یونین میں اقبال کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے ۔ اس ضمن میں سابق سوویت یونین کے دانش وروں ، ادیبوں اور متعلقہ اداروں کو ان کی سرد مہری کے سلسلے میں موردِ الزام ٹھہرانا کچھ زیادہ درست نہیں ہو گا ، بلکہ اس باب میں برصغیر میں ترقی پسند تحریک کے اوائل میں بیشتر ترقی پسند ادیبوں میں جو انتہا پسندی کی رو اور روش پیدا ہو گئی تھی ، اس کے نتیجے میں علامہ اقبال کے نظریات و افکار کی تفہیم کج روی کا شکار ہو گئی تھی ۔ بعض نے علامہ اقبال کو فسطائیت کا طرف دار قرار دیا اور بیشتر نے ان کے فلسفے کو رجعت پرستی پر مبنی گردانا اور نتیجۂ کلام اقبال جو ایک بحرِ بے کراں کے مانند ہے جس میں سطحِ آب پر جو

لہریں موج زن ہیں ، ان سے کہیں زیادہ توانا و طاقت ور لہریں اس کی گہرائیوں میں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں جن کے ادراک اور مشاہدے سے ترقی پسند حلقے ایک عرصۂ دراز تک محروم اور نابلد رہے اور ان کی نارسائی سابق سوویت یونین کے دانش وروں اور ادیبوں کی نارسائی پر منتج ہوئی ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے آج کھلے ذہن سے تسلیم کرنا چاہیے ۔ مطالعۂ اقبال کے باب میں پچاس کی دہائی سے ترقی پسند حلقوں میں جو مثبت تبدیلی آئی ہے اور علی سردار جعفری سمیت معتبر ترین ترقی پسندوں نے اقبالیات پر جو گراں قدر اضافے کیے ہیں ، ان کی ہمہ گیری و وسعت کو مزید فروغ دینے کی ذمے داری نئی نسل کے ترقی پسندوں پر عائد ہوتی ہے ۔

علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت و مفکرانہ رفعت کے حوالے سے اب تک جو کچھ ہوا ہے ، اس میں کوئی اضافہ کرنا ممکن نہیں ہے ۔ ہمیں جن امکانات کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے ، وہ فکرِ اقبال کی روشنی میں ہم عصر زندگی کو درپیش سوالات کے جوابات کی جستجو ہے ۔ بیسویں صدی کو فکر و فن کے حوالے سے اقبال کی صدی کہنا کوئی مبالغہ آمیز بات نہیں ہے ۔ میر و غالب اور اقبال ہماری ادبی تاریخ کے تین اہم ترین ادوار یا ابواب کہے جا سکتے ہیں ۔ اقبال کا دور ہنوز جاری ہے ۔ اردو شاعری کو جو اعتبار و وسعت و تنوع کلامِ اقبال سے حاصل ہوا ہے ، وہ غیر متنازعہ حقیقت ہے ۔ کلامِ اقبال کے ذریعے پہلی مرتبہ اردو شاعری مغرب و مشرق کے بیشتر نظریات اور فلسفے سے متعارف ہوئی ۔ علامہ اقبال کی خلاقیت کے طفیل دامنِ شعر کو وہ وسعت نصیب ہوئی کہ نظریہ و فلسفہ ، خواہ اس کا تعلق کسی فکر و عہد سے ہو ، پہلی مرتبہ شاعری میں شعری جمالیات کے ساتھ برتا گیا ، اس طرح اردو شاعری میں آج وہ سب کچھ موجود ہے جو دیگر زبانوں کے ادب میں پایا جاتا ہے ۔ علامہ اقبال کے یہاں حیات و کائنات کے تمام گوشے پوری تابندگی کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں ، خاص طور پر بیسویں صدی کی کوئی فکری لہر اور نظریاتی رو ایسی نہیں ہے جو اقبال میں

موجود نہیں ۔

علامہ اقبال کا فلسفۂ حیات و کائنات کا مطالعہ ہر لمحے ہمارے سامنے ایک جہان تازہ وا کرتا ہے ۔ وہ زندگی اور کائنات کی ہمہ وقت تغیر پذیری پر گہری نگاہ رکھنے والے مفکر ہیں ۔ ان کے یہاں وقت کے ساتھ ہر چیز حرکت میں ہے ، اور حرکت قانون ارتقا کی جان ہے ۔ وہ فکری سطح پر منقولات کے بجائے معقولات ، دائمی اور راسخ العقیدگی کی جگہ اجتہاد کے ذریعے تبدیلیوں کے خواہاں تھے ۔ ان کے یہاں طبیعیات و مابعد الطبیعیات کے درمیان ایک اعتدال و توازن پایا جاتا ہے ۔ ہم عصر زندگی کے کرب و اضطراب کے اسباب و علل سمجھنے کے لیے ہمیں فکرِ اقبال سے رجوع کرنا چاہیے ، کیونکہ بے سمتی اور نراجیت سے بچنے میں مطالعۂ اقبال ہماری بڑی مدد و دست گیری کر سکتا ہے ۔

اپریل ، ۱۹۹۲ء

# ڈاکٹر وزیر آغا اور مارکسزم

ماہ نامہ اوراق، لاہور کا سال نامہ (فروری، مارچ ۱۹۹۵ء) اپنی تمام تر روایتی خصوصیات کے ساتھ ان دنوں اپنے قارئین کے زیرِ مطالعہ ہے۔ بیشتر ادبی رسائل میں مواد کا احاطہ کرنا چند گھنٹوں میں ممکن ہو جاتا ہے، مگر "اوراق" کے شمارے میں شائع شدہ مواد کا احاطہ کرنا قارئین کے لیے چند دنوں میں بھی ممکن نہیں ہوتا، چنانچہ یہ شمارہ میرے مطالعے میں گزشتہ کئی دنوں سے ہے مگر ہنوز سفرِ مطالعہ جاری و ساری ہے۔

زیرِ نظر شمارہ حسبِ معمول خاصا ضخیم ہے، یعنی تقریباً پونے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور ادب کے تمام تر شعبوں اور اصناف کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے نثری اور شعری حصے یکساں متاثر کن ہیں۔ شعری شعبے میں غزلوں کا غالب حصہ ہے اور یہ ہونا بھی چاہیے کہ غزل آج بھی ہمارے یہاں سب سے مقبول اور معتبر صنفِ سخن ہے اور کسی شاعر کا منصب و مقام متعین کرتے وقت اس کی غزل گوئی کو ضرور پیشِ نظر رکھا جاتا ہے، بلکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے جس شاعر نے غزل کو نظر انداز کیا یا اسے ثانوی حیثیت دی، وہ خود نظر انداز ہو گیا اور اس کی مقبولیت محدود سے

محدود تر ہوتی گئی۔ بات یہاں سے آگے کی ہے۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی عشرے میں غزل کی پذیرائی سے بیشتر ترقی پسند شعرا نے روگردانی کی اور غزل کو نظرانداز کرنے کی روش اپنائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غزل تو نظرانداز نہیں ہو پائی، وہ شعرا وقت کے گزرنے کے ساتھ طاقِ نسیاں کی زینت بنتے گئے یا ان کی چمک دمک ماند پڑتی گئی اور خود ترقی پسند تحریک اس سے متاثر ہوئی۔ غزل کی طرف سے یہ مغائرت کا رویہ اگر اپنایا نہیں گیا ہوتا تو ترقی پسند تخلیقات اور نگارشات میں ہنگامی اور وقتی عناصر کی کارفرمائی میں وہ شدت یقیناً نہیں ہوتی اور بلند آہنگی کا وہ انداز بھی نہ ہوتا جو ادب کو نعرے بازی کے زمرے میں شامل کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ ترقی پسند نگارشات پر ایک اہم اعتراض اس حوالے سے رہا ہے جس کا بعد میں سنجیدگی سے نوٹس لیا گیا اور ادبی تخلیقات کو حتی الامکان اس سقم سے محفوظ رکھنے کی راہ اپنائی گئی۔ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ غرض، زیرِ نظر شمارے میں غزل کی بھرپور نمائندگی ہے اور مختلف نسلوں اور مکاتیبِ فکر و نظر کے غزل گو شعرا کی تخلیقات شاملِ اشاعت ہیں۔ نظموں کا حصہ بھی خاصا وقیع ہے اور یہاں بھی نئے اور پرانے نام بلا تخصیص نظر آتے ہیں۔ نظموں کے علاوہ ہائیکو، دوہے اور ماہیے بھی ہیں، گویا شعری اصناف میں شاید ہی کوئی صنف نظرانداز ہوئی ہو۔ روایت کے مطابق رشید نثار کے لیے گوشہ مخصوص کیا گیا ہے جس میں صاحبِ گوشہ کی شخصیت اور فن کا بڑے سلیقے اور خلوص کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔

تخلیقی ادب میں افسانوں کو خاص مقام حاصل ہے، چنانچہ "اوراق" میں اس صنف کی نمائندگی ہمیشہ بڑی وزن دار رہی ہے، سو یہ صورتِ حال اس شمارے میں بھی ہے اور متعدد جانے پہچانے افسانہ نگاروں کی تحریریں اس گوشے کی زینت ہیں۔ تجزیاتی مطالعے کے ذیل میں تین تخلیقات پر پرمغز اظہارِ خیال تین صاحبانِ رائے نے کیا ہے جن میں خود ڈاکٹر وزیر آغا بھی شامل ہیں۔ تخلیقات کو

پرکھنے اور سمجھنے کا یہ اسلوب اچھوتا ہے اور دلچسپ بھی ۔ غالباً اس اختراع کی طرح "اوراق" نے ڈالی ہے اور یہ "اوراق" کے یکے از بسیار خصوصیات میں شمار کیا جانا چاہیے ۔ انشائیے کے علاوہ نثرِ لطیف کے تحت بھی متعدد تحریریں ہیں ۔ انشائیہ تو ڈاکٹر وزیر آغا کے نام موسوم ہے ہی ، نثرِ لطیف کے تحت شامل اشاعت تحریریں انشائیے کے خدوخال کو اور نمایاں کر رہی ہیں ۔ مزاح کا شعبہ بھی موجود ہے ، گو اس باب میں صرف ایک مضمون ہے ڈاکٹر روف پاریکھ کا 'ووٹوں کے انتخاب نے' کے زیرِ عنوان ۔ اس طرح 'انشائیہ' ، 'نثرِ لطیف' و 'مزاحیہ' کے زیرِ عنوانات شامل اشاعت تحریریں اور ان تینوں اصناف کے درمیان جو نازک فاصلے ہیں ، ان کا خیال "اوراق" کی مجلسِ ادارت نے بڑی احتیاط کے ساتھ رکھا ہے ۔

"بازگشت" میں ڈائجسٹ اور ادب کے موضوع پر مشتاق احمد قریشی کا بھرپور مقالہ ہے جو سیر حاصل گفتگو کا حق دار ٹھہرتا ہے ، مگر یہاں اس کا کوئی جواز نہیں ہے اس کتاب میں 'اور' نئی کتابیں 'کے تحت "اوراق" ہر بار کتاب کی دنیا کی اچھی خاصی سیاحت کا فریضہ انجام دیتا ہے ، سو اس شمارے میں بھی اٹھارہ نئی کتابوں کے بارے میں بڑی بنیادی اور مفید معلومات اور آرا قارئین کے ذوقِ مطالعہ کے لیے مہمیز کا کام کریں گی ۔ مقالات کا گوشہ بے حد وقیع ہے ۔ ادیب سہیل کا مقالہ 'کاشف الحقائق' امداد امام اثر کی مذکورہ شہرۂ آفاق تصنیف پر متاثر کن اور علم میں اضافے کا سبب بنتا ہے ۔ "معنیٰ اور تناظر" پر ڈاکٹر وزیر آغا کا اظہارِ خیال ذہن کو جلا بخشنے اور اجتہادی تحریر کہلانے کا مستحق ٹھہرتا ہے ، گویا اس شمارے میں ایک جہان ادب کو محصور کر دیا گیا ہے ۔ اس موقع پر یہ عرض کرتا چلوں کہ میرے پیش نگاہ زیرِ نظر شمارے پر تبصرہ نہیں ۔ اس ذیل میں جو کچھ کہا گیا ہے ، اسے آپ جملہ ہائے معترضہ سمجھیں ۔ مجھے دراصل زیرِ نظر شمارے کے اداریے 'پہلا ورق' کے حوالے سے کچھ اظہارِ خیال کرنا ہے جس میں شامل اشاعت کلیدی مقالے 'اردو

تنقید کا مسئلہ اور نو تاریخیت' کو موضوع گفتگو بنایا گیا۔ یہ کلیدی مقالہ پروفیسر ریاض صدیقی کا تحریر کردہ ہے۔

اوراق کا "پہلا ورق" ادبی جریدوں میں شائع ہونے والے اداریوں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کا حامل گردانا جاتا ہے۔ ان اداریوں کا مجموعہ 'پہلا ورق' کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے جس کا اس طرح شائع کیا جانا اس کا حق بنتا تھا۔ زیرِ نظر "پہلا ورق" کا پہلا پیراگراف اختتامِ صدی کے مرحلے پر بیسویں صدی کے دوسرے بڑے واقعے جسے سانحہ کہنا زیادہ درست ہے، یعنی سوویت یونین کے انہدام کے بارے میں ہے۔ میرے نزدیک اس صدی کا سب سے پہلا بڑا واقعہ ۱۹۱۷ء کا انقلابِ اکتوبر ہے۔ یہاں کہا گیا:

> "روس میں کمیونزم کے تجربے کی ناکامی کے بعد اکثر لوگ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مارکسی تھیوری ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے لیکن کیا واقعی؟ کیونکہ کسی بھی تھیوری کے عملی اطلاق کے ضمن میں کیے گئے کسی تجربے کی ناکامی کو خود تھیوری کی ناکامی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ چین کی مثال سب کے سامنے ہے، کیوبا کا تجربہ بھی پیشِ نظر ہے۔ اسکینڈے نیویا کے ممالک کے سماجی ڈھانچے میں سوشلزم کے جو غالب عناصر نظر آتے ہیں، وہ بنیادی مارکسی تھیوری ہی سے ماخوذ ہیں۔ خود مارکسی تھیوری اپنے اندر مختلف حالات سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے"۔

یہ چند سطریں ڈاکٹر وزیر آغا کی وسعتِ نگاہ کے ساتھ ہم عصر تاریخ پر ان کی گرفت اور بصیرت و بصارت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مارکسزم کی ہمہ گیریت اور ہمہ گیر اثرات کی طرف ڈاکٹر وزیر آغا نے جو اشارے کیے ہیں اور جن گوشوں کی نشان دہی کی ہے، ان پر صاحبانِ فکر و شعور کو غور و خوض کرنا چاہیے، وہ بے حد گراں قدر بھی ہیں اور وہ

مشعلِ راہ کا درجہ بھی رکھتے ہیں ۔یہاں عرض کر دینا اس بات کو آگے بڑھانے کے مترادف ہے جو ڈاکٹر صاحب نے چھیڑی ہے کہ خود سرمایہ دار دنیا میں ریاست کے فرائض منصبی اور کردار جو اس صدی میں متعین ہوئے ہیں جن کی وجہ سے آج بیشتر سرمایہ دار ریاستیں فلاحی مملکتیں بن گئی ہیں ، یہ تبدیلیاں اور تشکیلات براہِ راست انقلابِ اکتوبر کے اثرات اور ردِ عمل کے زمرے میں آتی ہیں ۔ فلاحی ریاست کا تصور براہِ راست مارکسزم سے مستعار تصور ٹھہرتا ہے ، ورنہ سرمایہ دار مفکرین سیاست کے نزدیک Laissez Faire کے نظریے کے تحت ریاست کی ذمے داریاں محدود سے محدود تر ہونی چاہیے تھیں ۔ رہی بات انقلابِ اکتوبر کی ناکامی اور سوویت یونین کے انہدام کی تو اس ضمن میں یہ کہنا کچھ زیادہ نادرست نہ ہو گا کہ انقلابِ اکتوبر کی عمر دوسرے تمام انقلابات کے مقابلے میں ، جو تاریخ انسانی میں ظہور پذیر ہوئے ، طویل تر بلکہ قابلِ رشک رہی ۔ ہم یہاں اہم ترین انقلابات کے ذکر پر اکتفا کریں گے جن انقلابات کے آدرش اور نصب العین پر آج تک حرف نہیں آیا ، ہر چند کہ ان انقلابات کے سیاسی ، سماجی اور اقتصادی شعبوں میں فیصلہ کن کردار اور اثرات بہت کم عرصے تک نظر آئے ۔ انسانی تاریخ میں اسلام کا ظہور اس کے روحانی پہلوؤں سے قطعِ نظر ایک عظیم انقلاب کا درجہ رکھتا ہے ۔ یہ انقلاب چار دہائیوں کا سفر طے کرنے کے بعد خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد ملوکیت میں تبدیل ہو گیا جو اس انقلابِ عظیم کے اغراض و مقاصد سے مطابقت نہیں رکھتا تھا ۔ اس عظیم انقلاب کا آدرش بہر حال زندہ رہا اور تاریخ انسانی کو مسلسل متاثر کرتا رہا ۔ اسی طرح انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) مشکل سے ایک عشرے تک جاری رہ سکا ۔ انیسویں صدی کی ابتدا کے ساتھ ایک بار پھر شہنشاہیت کا سایۂ عاطفت فرانس کا مقصد ٹھہرا ، مگر انقلابِ فرانس کی روح زندہ رہی اور اس کی کارفرمائی جاری و ساری رہی اور کرۂ ارض کا کوئی گوشہ جہاں شرفِ انسانیت اور انسانی اخوت کی کوئی تحریک چلی اس انقلاب کا نعرۂ عظیم equality, liberty and fraternity ، یعنی مساوات ،

آزادی اور اخوت انیسویں اور بیسویں صدی کی تمام تحریکوں کا منشور تسلیم کیا گیا۔ انقلابِ فرانس نے جدید دنیا کی سیاسی تشکیلِ نو میں رہ نمایانہ کردار ادا کیا، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سوویت یونین کے انہدام سے انقلابِ اکتوبر کی ناکامی متصور ہو تو بھی انقلابِ اکتوبر کا نظریہ و فلسفہ اور اس کے آدرش کی صداقت کے اعتراف اور اس کے اثرات و کردار سے انکار تاریخ کے سفر سے ناآگاہی قرار پائے گا۔ جب تک کرۂ ارض پر انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال قائم ہے، اس کے خاتمے کا نصب العین خواب بھی ہی مگر اس کی سچائی کیونکر مشکوک ہو سکتی ہے؟ انسانی معاشرے کو تبدیل کرنے کی تمنا اور ایسی دنیا تعمیر کرنے کی آرزو کو جہاں غربت و ناداری اور عدم مساوات کی عمل داری کی جگہ خوش حالی اور شرفِ انسانیت کا بول بالا ہے، کوئی صداقت کے سوا کیا کہہ سکتا ہے؟ مارکسزم ویسے تو بقولِ ڈاکٹر وزیر آغا آج بھی عملی صورت میں چین اور کیوبا میں قائم و دائم ہے، مگر اس سے قطعِ نظر مارکسزم کا کردار ایک نظریے کی حیثیت سے تاریخِ انسانی میں صدیوں تک دیکھا جائے گا۔ میرے نزدیک انقلابِ اکتوبر کا زوال اور سوویت یونین کا انہدام تاریخِ انسانی میں ایک المیہ قرار پائے گا۔ سوویت یونین کی ریاستوں میں اس کے انہدام کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہوئی ہے اور اعلیٰ انسانی اقدار کی جو پامالی ہو رہی ہے، وہ ناقابلِ تصور ہے۔ سوویت یونین کے دور کا انسان جس کی زندگی میں سماج کو بہتر خطوط پر تبدیل کر کے انسانیت کو عروج و ترقی سے ہم کنار کرنا تھا، آج وہ خود غرضی اور خود پرستی کے vicious circle میں گرفتار ہو گیا ہے اور تمام تر اقدار اور مشن سے اس کی زندگی عاری ہو گئی ہے۔ سوویت معاشرہ جن سماجی برائیوں اور جرائم سے تقریباً ناآشنا تھا، آج وہ معاشرے انقلابِ اکتوبر کی [illegible] سے بھٹک کر بنیادی شرفِ انسانیت سے محروم ہو گیا ہے اور مغربی معاشرے سے [illegible] زیادہ سنگین جرائم اور برائیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ اسے انسانی معاشرے کا زوال کہنا

جاہیے جہاں جبریلیت کی پسپائی اور ابلیسیت کی پیش رفت ہوئی ہے۔

بہرحال ڈاکٹر وزیر آغا کی اس رائے سے بھی اختلاف مشکل ہے کہ بہت سے ترقی پسند ادیب اور ناقدین dogmatic ہو گئے ہیں اور " یہ لوگ ابھی تک اسٹینڈرڈ مارکسی نظریے سے چمٹے ہوئے ہیں اور اس کے عملی اطلاق کے روسی تجربے کی ناکامی کے باوجود اس بات پر مصر ہیں کے آخری فتح اسٹینڈرڈ نظریے ہی کی ہوگی "۔ یہ رویہ بذاتِ خود غیر مارکسی رویہ ہے اور مارکسزم کی روح سے متصادم ہے۔ جدلیاتی فلسفے میں تبدیلی سب سے بڑی حقیقت ہے جو روح ارتقا بھی ہے۔ یہ تبدیلی جاری و ساری عمل ہے اور جس طرح ظہور پذیر ہوئی، اس کا ادراک مارکسزم کا حاصل مطالعہ ہے۔ میرے نزدیک سوویت یونین کے انہدام، یعنی انقلابِ اکتوبر کی شکست کے دیگر اور عوامل میں مارکسزم کو ایک dogma قرار دینے کا عمل سب سے کلیدی عنصر ہے۔ ادب کی دنیا میں بھی اس رویے کے اثرات ترقی پسند ادب کو پیش آنے والے setbacks میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ترقی پسند دانش وروں اور ناقدین میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو معاشرے میں پیدا ہونے والے نئے حالاتِ کار اور اس کے نتیجے میں تبدیلیوں کے ادراک سے قاصر رہے اور ادب میں نئے رویوں اور نئی حسیت کی پاس داری کے بجائے نئے افکار و رجحانات سے گریزاں اور خائف رہے جس طرح ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ادبی منظرنامے پر آنے والی تبدیلیوں کی طرف سے روایت اور دقیانوسیت سے جکڑے ہوئے ادیبوں اور قلم کاروں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور ترقی پسند تحریک سے متاثر ادب پاروں کو بغیر دلائل براہین مسترد قرار دیتے تھے اور طرح طرح کے فتوے صادر کرنے لگے تھے۔ یہی کچھ حال ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز سے نئے رویوں، نظریوں اور نئی حسیت کے باب میں سکہ بند ترقی پسندوں کا دیکھنے میں آیا۔ ان کا بنیادی سبب مارکسزم کو ایک dogma کے طور پر قبول کرنا تھا۔ اگر اسے ایک ایسی سائنس سمجھا جاتا جو تحرک و تبدل کا سرچشمہ ہے تو یہ نوبت

نہیں آتی کہ ترقی پسند دانش ور اور ناقد بھی نئے نظریات اور رجحانات سے بھڑک اٹھتے اور انسانی شعور کی پیش رفت کے سفر سے مایوس ہو جانے کے عمل کا اظہار کرتے۔ بہرحال یہ طمانیت کی بات ہے کہ ترقی پسندوں میں dogmatic ہونے کا احساس جاگا ہے اور وہ اپنی اس خامی سے دامن کش ہونے کی سعی کر رہے ہیں اور ترقی پسندیت کا نئے حالات میں از سرِ نو جائزہ لیا جا رہا ہے اور آج ترقی پسندیت کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے، اس پر سنجیدگی سے غور و خوض ہو رہا ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں جب ترقی پسند ادیب اور قلم کار سوویت یونین کے انہدام کے shock سے باہر نکل آئیں گے اور مارکسزم کی بہتر تفہیم کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی سمت متعین کریں گے۔

پروفیسر ریاض صدیقی ان ترقی پسند ادیبوں اور ناقدوں میں ہیں جن کا ترقی پسندیت سے commitment اور مارکسزم کے بارے میں ان کا conviction کسی مرحلے اور منزل میں متزلزل نہیں ہوا، اور انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی نگارشات میں ان صداقتوں کی روشنی قائم رکھی جو انھوں نے مارکسزم سے حاصل کی تھی، ہرچند کہ وہ ایک طرف Stalinism کے قائل ہیں تو دوسری طرف مغرب میں مارکسزم کے تازہ تر مطالعے اور تجزیے سے خود کو well-connected رکھا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ مقالہ " اردو تنقید کا مسئلہ اور نوتاریخیت " ان کے تازہ تر مطالعوں اور حوالوں سے عبارت ہے۔ اس مقالے کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کو میں endorse کرتا ہوں کہ

" زیرِ نظر ' اوراق ' میں ہم ' اردو تنقید کا مسئلہ اور نوتاریخیت ' کے عنوان سے ریاض صدیقی صاحب کا ایک کلیدی مقالہ پیش کر رہے ہیں جس میں انھوں نے نہایت خوبی سے

نوتاریخیت کو اس کے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اردو ترقی پسند ناقدین کو بالخصوص اور دوسرے ناقدین کو بالعموم اس پر مغز مقالے کا مطالعہ کرنا چاہیے"۔

مارچ، ۱۹۹۵ء

# سرد جنگ کا خاتمہ

۱۹۹۰ء کے آغاز سے ایک نئے سال کے ساتھ ایک نئے عشرے کا بھی آغاز ہوا ہے ۔ یہ بیسویں صدی کا آخری عشرہ ہے ۔ بیسویں صدی میں انسانی تہذیب نے جو مدارج طے کیے ، وہ ہر اعتبار سے قابل فخر ہیں ۔ اس صدی میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوا ، وہ پوری انسانی تاریخ پر سبقت لے جانے کے مترادف ہے ۔ دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں جو تباہیاں اور ہولناکیاں رونما ہوئیں ، کروڑوں انسانوں کی اموات کے ساتھ جو مصائب و آلام انسانی معاشرے کو میسر آئے ، وہ بیسویں صدی کے ادبیات کے انمٹ نقوش بن گئے ہیں ۔ عالمی ادب کے افق پر ان سانحوں نے جانے کیسے کیسے تخلیقی معجزے دکھائے ہیں ۔ انسانی شعور نے اس سفر میں جو کچھ پرکھا اور جانچا اور جو سمتیں طے کیں ، وہ بھی ہماری فکری اساس میں شامل ہیں ، یہی وجہ ہے کہ اس عشرے میں بنی نوع انسان کو آنے والی اکیسویں صدی کے خیر مقدم کی تیاریاں کرنی ہیں ۔ گزشتہ پانچ برسوں سے اس جہت میں پیش رفت جاری ہے اور جو کچھ اب تک ہوا ہے ، وہ خاصا وقیع اور گراں قدر ہے ۔ یہ امر واقعہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں کرۂ ارض پر امن و آشتی کی تیز ہوائیں چل رہی ہیں جس کے نتیجے میں کشیدگی اور

جنگ کے بادل ناپید ہوتے جا رہے ہیں اور ۱۹۸۹ء تو ایک عظیم سال کے طور پر یاد رکھا جائے گا جب سرد جنگ کے خاتمے کا سال کہا جائے گا۔ جمہوریت، جو اصل شرفِ انسانیت کی علامت اور معرکۂ خیر و شر میں انسانی عظمت کی فتح و نصرت کا پرچم ہے، کی سربلندی کی نئی رزمیہ داستانیں ۱۹۸۹ء میں مرتب ہوئی ہیں، اور یہ سب مثبت تبدیلیاں پرامن طور پر عمل میں لائی گئی ہیں جو بذاتِ خود بہت بڑی بات ہے۔ بہرحال آنے والے چند برس تاریخ انسانی میں بڑی اہمیت کے حامل ثابت ہوں گے۔

گزشتہ عشرے کے دوران اور خصوصیت کے ساتھ پچھلے چند برسوں میں ساری دنیا میں جو مثبت اور پرامن سوچ پیدا ہوئی ہے اور امن اور جمہوریت کے حوالے سے جو خوش گوار فضا پیدا ہوئی ہے، اسے مزید سازگار اور خوش گوار تر کرنے کی شدید ضرورت ہے، کرۂ ارض سے کشیدگی اور تناؤ دور کرنے کا موجودہ عمل تیز تر ہونا چاہیے۔ جنگ کے امکانات کو معدوم کرنے کی تحریک اور جدوجہد آج دراصل انسانی تہذیبی ورثے بلکہ نسلِ انسانی کی بقا کی جدوجہد اور تحریک ہے۔ یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ آج عالمی رائے عامہ امن اور جمہوریت کے حق میں اس قدر طاقت ور ہو چکی ہے کہ جمہوریت دشمنی اور جنگ جوئی کی حکمتِ عملی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ امن اور جمہوریت لازم و ملزوم ہیں اور ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جنگیں جمہوریت دشمن اور فسطائیت کی آغوش میں پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ جمہوریت کا فروغ دراصل امن کے استحکام اور اس کی بنیادوں کو مضبوط تر کرنے کا ضامن ہے۔ جمہوریت کا کوئی نعم البدل نہیں، لہٰذا کسی بھی نظریے اور نظام کے حوالے سے جمہوری اقدار اور نصب العین کو کم تر دکھانا اور نظرانداز کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسانی شعور آج اس مقام پر ہے کہ اسے فریب دے کر کسی قسم کے جبر کا شکار نہیں رکھا جا سکتا۔ جس انسان نے ہزاروں سال پر محیط معرکۂ خیر و شر میں ظلمت و جبر کے عفریت پر فتح پائی ہے اور انسان کے

ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ کیا ہے ، وہ انسان کسی کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ دوبارہ صدیوں پرانے استحصال کا اعادہ ہو یا استحصال کا احیا کسی نئے روپ اور لبادے میں ہو ۔ جبر و ستم کی جو زنجیریں انسانی عزم نے پاش پاش کر دیں ، وہ اب دوبارہ جوڑی نہیں جا سکتیں ۔ آزادی فطرت انسان کا اولین انتخاب ہے ۔ آزادی کے بغیر کسی ترقی اور خوش حالی کا تصور فطرتِ انسانی کو گوارا نہیں ہے ۔ انسانی تہذیب آنے والے صدی میں نئی بلندیوں کو چھو لے گی اور انسانی معاشرہ آزادی ، ترقی اور خوش حالی کی ان منزلوں سے ہم کنار ہو گا جو اب تک تخلیق کاروں کا خواب رہا ہے ۔ ہم انھی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ یہ عشرہ گزارنا چاہتے ہیں ، اور ہم اپنی تحریروں اور نگارشات میں امیدوں اور توقعات کی ایسی کہکشائیں سجانا چاہتے ہیں جن سے ہماری زمین آنے والی صدی میں زیادہ منور اور تابندہ تر ہو سکے ۔

جنوری ، ۱۹۹۰ء

# علامہ اقبال اور انقلاب اکتوبر

نومبر کا مہینہ بین الاقوامی منظرنامے پر انقلابِ اکتوبر (۷ نومبر، ۱۹۱۷ء) کے حوالے سے گزشتہ ۷۳ برسوں سے توجہ کا مرکز بنتا ہے، اور ہمارے قومی ثقافتی ورثے کے رشتے سے یہ ماہ (۹ نومبر) حالیہ تحقیق کی روشنی میں علامہ اقبال سے موسوم و منسوب ہے۔ علامہ اقبال اور انقلابِ اکتوبر کا ہمارے نزدیک باہم تذکرہ نہ تو بے محل ہے اور نہ معنویت سے عاری۔ انقلابِ اکتوبر کو علامہ نے اپنی شعری نگارشات میں ایک اہم موضوع کے طور پر برتا ہے اور اس کے ہمہ گیر اثرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس ضمن میں علامہ کا یہ شعر زباں زدِ خاص و عام رہا ہے:

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

انقلابِ اکتوبر کی علامہ کی نظر میں اہمیت اور قدر و قیمت انسانی تاریخ پر اس کے دور رس اور ہمہ جہت اثرات کی بنا پر تھی جو ان کی دروں بینی اور ژرف نگاہی کے ساتھ ہم عصر تاریخِ عالم پر ان کی گہری نظر کی غمازی کرتی ہے اور ان کی وسعتِ فکر و

نگاہ کی نشان دہی بھی ۔ ان کے شعری رویوں اور فکری دھاروں کو سمجھنے کے لیے یہ موضوع ایک اہم موڑ کا درجہ رکھتا ہے ۔ یہ شعری رویے اور فکری دھارے بیسویں صدی کے اردو ادب کے غالب رجحانات اور عناصر کی اساس ثابت ہوئے ۔ سچ تو یہ ہے کہ علامہ اقبال ہمارے تہذیبی سفر میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا موڑ رہے ہیں ۔ ان کے ہاں جدید خیالات و تصورات جس واضح شکل میں نظر آتے ہیں ، ان سے پہلے کسی کے ہاں دکھائی نہیں دیتے ۔ انھیں مغربی علوم ، فکر و فلسفہ اور نظریات پر سرسید اور دوسرے پیش رووں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دسترس اور گرفت حاصل تھی ۔ بنیادی طور پر وہ فلسفے کے آدمی تھے ۔ تاریخ انسانی پر ان کی بڑی گہری نظر تھی اور انھوں نے مشرقی اور مغربی ادب اور افکار کو بہت زیادہ باریک بینی اور تفصیل کے ساتھ دیکھا تھا ۔ بساطِ عالم پر رونما ہونے والی سیاسی ، سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں ، نوآبادیاتی نظام اور سرمایہ دارانہ استحصال پر بھی ان کی توجہ تھی ۔ یہ ساری باتیں ان کی شاعری میں ایک مثبت رویے کے طور پر آئی ہیں ۔ کلامِ اقبال کا مطالعہ قارئین کے لیے گویا جامِ جمشید کا مشاہدہ کرنے کے مترادف ہے جس میں ہم عصر دنیا اور زندگی کو درپیش تمام مسائل و مراحل ، واقعات و انقلابات اور اظہار و رجحانات کا واضح عکس دیکھا جا سکتا ہے بلکہ ماضی اور مستقبل کے نقوش بھی مختلف تناظر میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔ کلامِ اقبال میں پہلی مرتبہ ایسے موضوعات کو شعری قالب ملا ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی کی بیشتر تحریکیں ، آزادی کی معرکہ آرائیاں ، انقلابات و اصلاحات کی داستانیں کہی جا سکتی ہیں ۔ کلامِ اقبال کا کینوس اتنا وسیع اور جامع ہے کہ اس کا کلیتہً ادراک حاصل کرنا اور اس کا احاطہ کرنا بذاتِ خود ایک بڑا کام اور کارنامہ قرار پا سکتا ہے ۔

اقبال شناسی کی راہ میں کلامِ اقبال کی جامعیت اور پھیلاؤ کی وجہ سے مختلف وقتوں میں مختلف شکوک و شبہات کا اظہار بھی ہوتا رہا ہے اور مختلف اعتراضات بھی

زیرِ بحث آتے رہے ہیں ۔ زندگی اور معاشرتی تبدیلیوں کے حوالے سے ان کے ہاں پائے جانے والے مثبت رویوں کے ساتھ کچھ تضادات کی بھی نشاندہی کی جاتی رہی ہے ۔ بنیادپرستی کے ساتھ فاشزم (fascism) کے لیے بھی ان کے ہاں ہمدردی (soft corner) پائی جانے کی بات چلی تھی ، لیکن بقول سبطِ حسن :

" اقبال کے ہاں لوگ جس تضاد کی نشان دہی کرتے ہیں ، وہ دراصل بورژوا تہذیب کا تضاد ہے جس سے مفر ممکن ہی نہیں ۔ اقبال پر وہی کچھ گزری ہے ، جو ہیگل پر گزری تھی ۔ ہیگل میں تضاد تھا ، یعنی ایک طرف وہ مابعد الطبیعیاتی (metaphysical) تصورات پیش کرتا ہے جو رجعت پسندانہ ہیں ، دوسری طرف اس کی epistomology ، یعنی تصورِ کائنات ہے جو انقلابی فلسفہ ہے جب وہ کائنات کی حرکت و تغیر کے بارے میں تجزیہ کرتا ہے تو جدلیاتی (dialectical) رویہ اپناتا ہے جو ترقی پسندانہ نقطہء نظر ہے ، لیکن دیکھیے ! نتیجہ کیا ہوا ۔ ہیگل کی جدلیات (dialecticals) کو تو مارکسزم نے اپنا لیا اور اس کی جو مابعد الطبیعیات (metaphysics) تھی ، اسے فاشسٹوں نے اپنا لیا ۔ جب وہ کہتا ہے کہ all that is, is just اور اسٹیٹ کی تعریف کرتے ہوئے جب وہ کہتا ہے کہ اسٹیٹ اسپرٹ کا اعلیٰ ترین مظہر ہے تو اس رجعت پسندانہ فلسفے کو ہٹلر استعمال کرتا ہے ۔ اب آپ دیکھیے کہ ایک ہی مفکر کے ہاں دو فکری دھارے ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہیں ، لیکن محض اس بنا پر ہیگل کے مرتبے اور عظمت کو تو رد نہیں کیا جا سکتا ۔ اقبال کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی ۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال مابعدالطبیعیات کے

دائرے سے باہر نہ نکل سکے لیکن ان کی جو epistomology یا
نظریۂ کائنات ہے اور ان کے ہاں تاریخ کو دیکھنے کا جو انداز ہے، وہ
یقیناً ترقی پسندانہ رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا تصورِ مذہب بھی بڑی
حد تک انقلابی ہے"۔

کلامِ اقبال دراصل ایک بحرِ بے کراں ہے جس میں پوشیدہ خزانوں کی دریافت کے لیے exploration کا عمل جاری و ساری رہے گا اور تاریخ ادب ان سے وقیع سے وقیع تر ہوتی جائے گی۔ اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں کلامِ اقبال کی حیثیت ایک سنگِ میل کی سی ہے جہاں پہنچ کر اردو شعر و ادب نے تکمیلِ فکر و فن کے بہت سے مراحل طے کیے ہیں، موضوعات اور اسالیب، ہر اعتبار سے نئے نئے امکانات سے ہماری شعری روایات روشناس ہوئیں۔ شعری ادب کی تمام تر اصناف کو علامہ کے یہاں ایک نئی معنویت اور treatment میسر آیا۔ خصوصیت کے ساتھ غزل کے دامن کو جو وسعت اور ہمہ جہتی حاصل ہوئی، وہ آگے چل کر اس کے وجود اور بقا کی ضمانت ثابت ہوئی اور غزل "تنگ نائے غزل" کے حدود و قیود سے نکل کر حیات و کائنات کی وسعتوں کو اپنے اندر سمونے اور سمیٹنے کی اہلیت کی بجا طور پر دعوے دار ہوئی۔ ہم عصر سماجی زندگی اور اس کی حیثیت اور شعور و ادراک کلامِ اقبال میں جس طرح برتے گئے، وہ آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ شعری قالب کو علامہ نے نئی توانائیاں بخشنے کے لیے اپنی فکر و فلسفہ کے علاوہ نئی لفظیات کی ایک ایسی کہکشاں سجائی ہے جس سے آسمانِ شاعری کو چار چاند لگ گئے اور افق تا افق روشنیوں کا کارواں رواں دواں نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پہلی مرتبہ کلامِ اقبال کے حوالے سے اردو شاعری کو عالمی ادب میں تعارف اور اعتبار حاصل ہوا۔

علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کا اظہار کرنے کے لیے نہ کسی غلو

کی ضرورت ہے اور نہ غیر ضروری مبالغہ آرائی کی ۔ ان کی شخصیت کی بڑائی "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مصداق ہے ۔ ان کی خلاقیت (creative genius) ان کی زندگی میں ہی تسلیم شدہ حقیقت کا روپ دھار چکی تھی ۔ کچھ حلقوں نے ان کی بلند قامتی کو استحکام بخشنے کے لیے ان کو روحانی مراتب دینا بھی ضروری سمجھا جو ہمارے نزدیک بھونڈی بات ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ ایک بڑی ناانصافی کرنے کے مترادف تھی ۔ علامہ اپنے عہد کے ایک عظیم مفکر تھے ، اور ان کا یہ منصب ہمارے لیے باعثِ صد افتخار ہے ۔ وہ ایک عہدآفریں اور عہد ساز شخصیت کے مالک تھے ۔ انسانی زندگی کے بارے میں علامہ اقبال کا نظریہ اس قدر توانا اور سائنٹفک نظریہ ہے کہ فرسودگی اور قنوطیت کا کہیں پاس سے بھی گزر نہیں ہو سکتا ۔ علامہ اقبال نے ادب اور زندگی ، ادب اور سماج کے رشتوں کو جو معنویت اور جہت بخشی ہے ، وہ ادب کو تمام تر مجہولیت ، انفعالیت اور لایعنیت سے دور رکھنے کے لیے عرصۂ دراز تک معاون و مددگار ثابت ہو گی ۔

فکرِ اقبال کا وسیع تر تناظر (perspective in totality) میں مطالعہ کیا جائے تو بنیاد پرستی اور راسخ العقیدگی ہماری رائے میں ان کے نظامِ فکر پر تہمت ہی قرار پائے گی ۔ وہ زندگی کی حرکی قوتوں کے مبلغ تھے اور تغیر و تبدل کو قانونِ فطرت کا محور جانتے تھے :

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

وہ تبدیلیوں کا خیر مقدم کرنے کے قائل تھے ۔ ان کے یہاں جمود اور سکوت کے لیے گنجائش نہیں تھی ۔ وہ منقولات کو رد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور معقولات اور اجتہاد پر ان کی خصوصی توجہ رہی ہے ۔ وہ نئے عہد کے نقیب اور نئی سحر کے سفیر تھے :

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے مسلسل صدائے کن فیکوں

نومبر ۱۹۹۰ء

# ادب کا سماجی منصب

فیض ! آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

دسمبر ، ۱۹۴۷ء کے شمارے میں ایک خصوصی ادارتی نوٹ میں ایک نئے سفر کی نوید ہم نے قارئین کو سنائی تھی ۔ وہ سفر زیرِ نظر شمارے میں پانچویں سال میں داخل ہو رہا ہے ۔ مذکورہ اداریے میں ہم نے اپنے نئے سفر کی راہیں اور سمت متعین کرتے ہوئے تحریر کیا تھا:

"ہماری ترجیحات ادب سے شروع ہو کر ادب پر اختتام پذیر ہوں گی ۔ اس سے ہماری مراد ادب کی مختاری (Autonomy of Literature) کے نظریے کی ترویج نہیں بلکہ ادب اور زندگی اور ادب اور سماج کے رشتوں کو نئی وسعتوں اور نئے امکانات سے ہم کنار کرنے کا اظہار ہے اور ادب کے سماجی کردار اور منصب کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی آرزو کا اعادہ ہے ۔ ہمارے

نزدیک ادب سماجی تبدیلی کا موثر ذریعہ ہے ، اور صرف commitment ہمارے وجود کو انسان اور ادیب کی حیثیت سے مستند کرتا ہے ۔ ہم قنوطیت ، انفعالیت ، قدامت پرستی مقدر پرستی اور زندگی کو فریب محض سمجھنے کے تصورات کو ادب کے لیے پیغام مرگ سمجھتے ہیں ۔ ادب کی زندگی کو تابندہ تر بنانے کے لیے ان کی نفی کرنا ہماری اہم ذمے داری بنتی ہے ۔ ابلاغ سے محروم نام نہاد تخلیقات خود ادب کو بے معنویت اور لایعنیت کا شکار کرتی ہیں ۔ انسانیت سے محبت اور انسانوں کے درمیان اخوت و مہر کے پاکیزہ جذبات کو فروغ دینا انسانی معاشرے کی ہمہ جہت ترقی اور خوش حالی کے لیے ناگزیر ہے ۔ فرقہ واریت ، تنگ نظری اور منافرت کے جذبات شرفِ انسانیت سے مطابقت نہیں رکھتے ، لہذا ایسی تخلیقات جن میں یہ منفی فکر کارفرما ہو گی ، وہ ہمارے معیار کے دائرے سے باہر ہی رہے گی ۔ انسان کی بقا اور ترقی کا انحصار عالمی امن پر ہے ، اور علم و ادب اور فکر و فن کے پودے جنگ کے زہریلے ماحول میں بارآور نہیں ہو سکتے ۔ ادب ، آرٹ اور وہ سب کچھ جو مقدس ، خوب صورت اور بامعنی ہے ، اس کی تخلیق امن اور آزادی کے ماحول میں ہی ممکن ہے ۔ زندگی اور موت ، امن اور جنگ ، نیکی اور بدی اور ایٹم بم اور پھولوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں ادب اور آرٹ نے ہمیشہ زندگی ، امن ، نیکی اور پھولوں کا ساتھ دیا ہے ۔ نظریاتی سطح پر بنیاد پرستی اور توہم پرستی کی جگہ روشن خیالی ، خرد افروزی ، تعقل پسندی رواداری اور سائنسی فکر کے تصورات اور آدرش کو آگے بڑھانے میں اپنی بساط بھر سعی مشکور

کرنا ہم اپنا خوش گوار فریضہ تصور کرتے ہیں ۔ ہمارا مسلک صحت مند اور زندہ ادب کا فروغ ہے .... ایسا ادب جو حسن و محبت کی نغمگی عشق و یقین کے سوز اور حق و صداقت کے خلوص سے لب ریز ہو .... ایسا ادب جو زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہو، جو لوگوں کو جگائے، آگے بڑھائے، تسکین دے اور طمانیت بخشے "۔

مذکورہ اداریے کے اقتباسات کی روشنی میں ہم اپنے گزشتہ چار سالہ سفر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ اظہار کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ جو سمتیں ہم نے متعین کی تھیں، ہمارا سفر انھیں سمتوں میں رہا اور یہ سفر پیش رفت کا سفر رہا ہے ۔ ہمیں خوشی ہے کہ آج ہمارا یہ جریدہ اردو دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے اور ہمیں معتبر اہل قلم کا تعاون اور سرپرستی حاصل ہے، ہمارے قارئین بھی اپنی پذیرائی سے نوازتے رہتے ہیں جو ہمارے لیے حوصلہ افزائی کا درجہ رکھتا ہے ۔ ہم نے اپنی طے شدہ ترجیحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فکر و فن کے تقاضوں، رجحانات اور رویوں کو متوازن اور مثبت طور پر برتنے کی اپنی سی کوشش کی ۔ نظریاتی طور پر ہم نے شعوری کوشش کی کہ ہم کسی شدت پسندی کے مرتکب نہ ہوں اور کسی sectarianism سے ہمارا دامن آلودہ نہ ہو ۔ ہم نے اپنے جریدے کو ایک ایسے فورم کے طور پر رکھا ہے جہاں مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کیے جاتے ہیں ۔ ہمارے اپنے نظریات وہ ہیں جو مذکورہ اداریے کے اقتباسات میں پیش کیے گئے ہیں، اور یہاں اقتباسات کو پیش کرنے کا منشا ان کا اعادہ بھی ہے اور اپنے موقف کو تبدیل شدہ عالمی تناظر میں بیان کرنے کی غایت بھی ۔ عالمی تناظر میں بنیادی تبدیلیوں کے نتیجے میں فکری اور نظریاتی دنیا میں لاتعلقی کے رویے کے بجائے تیز تر تبدیلیوں کا اظہار کیا جا رہا ہے، ادبی نظریات پر از سر نو غور و خوض ہو رہا ہے ۔ کچھ لوگ جو ایک عرصے سے اس صدی کو نظریات کی شکست و ریخت کی صدی گردانتے

آئے ہیں ، وہ اپنے موقف اور رویوں کی صحت پر آج بہت زیادہ مطمئن نظر آتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ افکار و نظریات ارتقائی مراحل میں ہیں اور ہمیشہ ہوں گے اور شکست و ریخت کے عمل کے ساتھ تعمیرِ نو کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے ۔ سماجی زندگی ارتقا پذیر ہے ۔ ارتقا پذیری قانونِ فطرت ہے ، خواہ اس کا تعلق کسی شعبۂ حیات سے ہو ۔ نظریات کی شکست و ریخت اور نئے نظریات کی تعمیر و ترقی ایک عملِ مسلسل ہے ۔ اس عملِ مسلسل کا ادراک یہ نہیں سکھاتا کہ اہلِ قلم نظریات سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور نظریات کے رشتوں کو فراموش کر کے ایسا ادب تخلیق کریں جو ایک طرف ابلاغ سے محروم ہو اور دوسری طرف فکری الحاد (confusion) کا آئینہ دار ہو ۔ ہمارے نزدیک تبدیل شدہ سماجی تناظر میں بھی ادب اور زندگی کے ناتے اور رشتے وہی رہیں گے جو پہلے تھے ، سماجی زندگی کی آئینہ داری کرنا ادب کا اب بھی منصب رہے گا ۔ ہمارے معاشرے کے مسائل اور مشکلات اور تضادات جو پہلے تھے ، وہ آج بھی ہیں ، لہذا ہمارا ادب ان سے چشم پوشی کر کے آگے کا سفر جاری نہیں رکھ سکتا ۔ کچھ خواب بکھر گئے ہیں تو اس کے ہرگز یہ معنی اور مفہوم نہیں کہ ہم نئے خواب نہ دیکھیں ۔ خوب تر کی منزل کی سمت گام زن رہنا ہماری زندگی کی بقا کا ضامن ہے اور یہی کچھ ادب پر بھی صادق آتا ہے :

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

نہ تن میں خون فراہم ، نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے ، بے وضو ہی سہی
(فیض)

جنوری ، ۱۹۹۲ء

# ڈاکٹر قمر رئیس اور ترقی پسند تحریک

ڈاکٹر قمر رئیس کہتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے":

"اس سوال کا جواب شاید مشکل نہیں ہے کہ کیا ترقی پسند تحریک ادب میں اپنا تاریخی رول ادا کر چکی ہے، اس لیے کہ اس صدی کے چوتھے دہے میں شروع ہونے والی یہ تحریک نہ صرف اردو بلکہ برصغیر کی تمام اہم زبانوں کے ادب میں دور رس تبدیلیوں کا سبب بنی۔ ان میں سے وہ تبدیلیاں جو ہماری تہذیب کے مزاج اور ادب کی روایت سے ہم آہنگ تھیں، آج بھی صحت افزا، گرم اور توانا خون کی طرح اس کی شریانوں میں رواں دواں ہیں، لیکن یہ سوال کچھ نزاعی سمجھا جاتا ہے کہ جب یہ تحریک اپنا عہد آفریں رول ادا کر چکی ہے تو پھر وقفے وقفے سے اس کی کانفرنسیں یا مذاکرے کرنے سے کیا حاصل، اس کی تنظیم کو برقرار رکھنے کے کیا معنی، اس سے ہمارے ادب کو یا ادیبوں اور فن کاروں کو کس طرح فیض پہنچ رہا ہے"۔

یہ اقتباس ڈاکٹر قمر رئیس کی زیرِ ادارت دہلی سے شائع ہونے والے جریدے 'نیا سفر، کتابی سلسلہ ۵' کے اداریے کا آغازیہ ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں اس اداریے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق چار مقالات و مضامین ہیں: (۱) روشن خیالی کے نئے تقاضے (پروفیسر محمد حسن) (۲) سیاست سے ادب کی سرحدوں تک (پروفیسر سید محمد عقیل) (۲) ترقی پسند ادبی تحریک.... مسائل اور مستقبل (اصغر علی انجینیر) (۴) ادب کی جدلیات (راشد آذر)۔ ان چار مقالات و مضامین کے علاوہ 'یاترا' کے زیرِ عنوان ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا تحریر کردہ رپورتاژ ہے جو مارچ ۱۹۹۵ء میں حیدرآباد میں ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی پچیسویں کل ہند سہ روزہ کانفرنس کی ۵۳ صفحات پر مشتمل مفصل کہانی ہے۔ رپورتاژ کے اختتام پر یہ نوٹ درج ہے کہ "ادارے کو افسوس ہے کہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے اس خوب صورت رپورتاژ کی تلخیص ہی اس شمارے میں پیش کی جا سکی۔ مکمل رپورتاژ جلد ہی آپ کتابی شکل میں پڑھیں گے"۔

غرض یہ کہ زیرِ نظر شمارے میں ان سوالات پر غور و فکر کرنے کے لیے کافی جامع اور وقیع مواد موجود ہے۔ خاص طور پر جناب اصغر علی انجینیر کا مقالہ "ترقی پسند تحریک.... مسائل اور مستقبل" براہِ راست ان سوالات پر غور و فکر کرنے میں رہنمائی کرتا ہے جن پر ہم آج گفتگو کر رہے ہیں۔ ان سوالات کا جائزہ لینے اور ان کے ممکنہ جوابات حاصل کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ان سوالات کی اہمیت پیشِ نظر رکھی جائے۔ یوں تو یہ سوالات گزشتہ چار دہائیوں سے ہمارے سامنے آتے رہے ہیں اور ان پر غور و خوض ہوتا رہا ہے، مگر اس وقت ان سوالات کی اہمیت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ توجہ طلب ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آج ان سوالات کو پیش کرنے والے ڈاکٹر قمر رئیس ہیں جو میرے نزدیک ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سجاد ظہیر کے بعد سب سے اہم شخصیت ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سجاد ظہیر اس تحریک کے سب سے بڑے بانی اور محرک تھے اور ان کی اس باب میں خدمات کا کسی سے

موازنہ کرنا ممکن نہیں ہے، مگر ڈاکٹر قمر رئیس نے اس تحریک کو گزشتہ ربع صدی سے ازسرِ نو منظم و متحرک کرنے میں سب سے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی سرگرمی کا اس وقت آغاز کیا جب برصغیر کی ادبی دنیا میں یہ تاثر عام تھا کہ ترقی پسند تحریک obsolete ہو گئی اور عملی طور پر ختم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اس تاثر کو رد کرنے اور ترقی پسند تحریک کی فعالیت اور معنویت (relevance & dynamism) کو نئے تناظر اور نئے امکانات کے ساتھ ثابت کیا اور اس کے حق میں فضا ہموار کی۔ اس ضمن میں ۱۹۸۵ء میں لندن میں ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس کے انعقاد میں ان کی پہل کاری اور کارکردگی ایک خصوصی حوالہ بنتی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں پاکستان اور ہندوستان میں گولڈن جوبلی کانفرنسیں بھی بلاشبہ لندن کانفرنس کی صدائے بازگشت تھیں، لہٰذا ان سوالات کی اہمیت اور معنویت پر آج کے نئے تناظر میں غور کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ آج کی دنیا اپنے مسائل و وسائل اور امکانات کے اعتبار سے بہت مختلف دنیا ہے۔ کچھ اربابِ فکر و نظر کی رائے میں آج کی دنیا uni-polar world ہے، جبکہ کچھ صاحبانِ رائے کے نزدیک آج کی دنیا multi-polar world بن چکی ہے۔ گزشتہ پانچ دہائیوں میں جو غیر معمولی سائنسی اور تکنیکی ترقی ظہور پذیر ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں خاص طور پر اطلاعات کے شعبے میں جو انقلاب آیا ہے، اس نے آج کی دنیا کو ایک global village میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب دنیا ایک ایسے سفر پر گام زن ہے جس سفر میں فاصلوں کا تصور مٹتا جا رہا ہے۔ اب ایک ایسے عہد کا آغاز ہو چکا ہے جہاں انسان خود کو کرۂ ارض کا باسی محسوس کرنے لگا ہے۔ اقتصادی زندگی میں inter-dependence اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ کوئی ترقی یافتہ بڑے سے بڑا ملک بھی اپنی ترقی کی رفتار کو solo flight کے ذریعے قائم نہیں رکھ سکتا۔ ثقافتی سطح پر ایک عالمی کلچر جنم لے رہا ہے جو صارفیت (consumerism) کے بطن میں گزشتہ

کئی عشروں سے پرورش پا رہا تھا۔

ترقی پسند تحریک کا سفر گزشتہ ۶۲ برسوں سے جاری ہے، کیونکہ بقول ڈاکٹر قمر رئیس "انگارے کی شاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا غیر رسمی اعلان نامہ تھی"۔ گویا چھ دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط اپنے اس طویل اور صبر آزما سفر میں ترقی پسند تحریک علم و دانش اور شعور و آگہی کی نت نئی مشعلیں روشن کرتی کٹھن اور دشوار گزار راہوں اور مرحلوں سے گزری اور سرخ روئی حاصل کی۔ یہ تحریک اپنے ہمہ گیر اثرات کے اعتبار سے عالمی ادبیات کی ان تحریکوں میں شامل ہے جنھوں نے اظہار و اسالیب کے نئے جہانوں کی تعمیر و تشکیل کی اور جدید رویوں اور حسیت کو پروان چڑھایا۔ اس تحریک کی ۶۲ سالہ تاریخ دراصل ان تخلیقی کارناموں کی تاریخ ہے جو ترقی پسند قلم کاروں نے جملہ اصنافِ ادب میں انجام دیے اور مآل کار اپنی اپنی زبانوں کے ادب کو لگی بندھی حدوں سے نکال کر زندگی کے وسیع تر ممکنہ گوشوں تک پھیلا دیا یہی نہیں بلکہ فکری سطح پر فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں پر نئی جہتوں اور نئے امکانات کے در وا کر دیے اور اس طرح نئے طرزِ احساس اور نئی جمالیات کی اقدار متعین کیں۔ یہ تحریک ہماری ادبی تاریخ میں ایک نئے انقلابی موڑ کا درجہ رکھتی ہے بلکہ اسے ایک ہمہ گیر انقلاب کہنا چاہیے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر ادب تمام تر وسعتوں اور ہمہ گیریت کے ساتھ زندگی اور سماج کا ترجمان بن گیا؛ ادب کو سماجی فریضے کا منصب سمجھا گیا اور ادب کو اپنی سماجی ذمے داریوں کا بھرپور ادراک ہوا؛ داخلیت پسندی کے حصار سے نکل کر اس نے اپنے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لیا؛ سماجی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کا آغاز ہوا۔ تخلیقی ادب انکشافِ ذات تک محدود نہ رہا بلکہ ادب کے لیے ایک سماجی فریضہ بن گیا۔

ترقی پسند تحریک کسی اتفاقی واقعے اور حادثے کی پیداوار نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ کے جدلیاتی عمل کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آئی۔ ترقی پسندیت قانون ارتقا سے

جڑی ہوئی ہے جس کا اطلاق سماج پر بھی ہوتا ہے اور سماجی ارتقا بھی اسی قانونِ ارتقا کے تابع ہے ۔ آغازِ تمدن سے زندگی کو پیش رفت کی راہ پر گام زن رکھنے اور رہ نمائی کرنے والی فکر ترقی پسند فکر ہے ، لہٰذا ترقی پسندیت کے Outdated اور obsolete ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا ۔ لہٰذا وہ لوگ جو ترقی پسند تحریک کے ختم ہو جانے یا زوال پذیر ہونے کی بات کرتے ہیں ، دراصل وہ اپنے complex اور bias کا اظہار کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔

ترقی پسند تحریک اور ادب پر تنقید اور اعتراضات کا سلسلہ اس تحریک کے آغاز سے چل رہا ہے جو جاری و ساری ہے ۔ پہلے ادب میں مقصدیت پر اعتراض ہوا ، پھر حقیقت نگاری کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا ، اس کے بعد ترقی پسندوں پر propagandist ہونے کا چارج لگایا گیا ۔ جنس پرستی اور فحش نگاری بھی ترقی پسند تحریک کے کھاتے میں ڈالی گئی ۔ اعتراضات کبھی فن کے حوالے سے کیے گئے ، کبھی اخلاقی اقدار کے حوالے سے اور کبھی ہنگامی موضوعات کے حوالے سے ۔ ان اعتراضات کے حوالے سے جناب علی سردار جعفری نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ " بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے معترضین کے لیے وجہِ شکایت ہماری شاعری نہیں بلکہ ہمارا فلسفۂ زیست رہا ہے " ۔ اس فلسفۂ زیست کا تعلق معاشرے کو تبدیل کرنے کا خواب ہے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل و تعمیر کا خواب جہاں انسانی ضمیر پر کوئی قدغن نہ ہو ، جہاں جبر و استحصال اور ناداری کی زنجیروں میں ذہن و ضمیر جکڑے ہوئے نہ ہوں ، جہاں انسان خوفِ فردا سے آزاد ہو اور عدم تحفظ کا آزار نہ ہو ، جہاں عدم مساوات اور سماجی ناانصافیاں انسان کا مقدر نہ گردانی جاتی ہوں اور جہاں زندگی چند لوگوں کے لیے جنت اور بیشتر خلقِ خدا کے لیے جہنم نہ ہو .... معاشرے میں بدصورتیوں کو جنم دینے والی مجبوریوں کے خاتمے کا خواب ۔ ترقی پسند تحریک کو اپنے نظریے کی وجہ سے جو عزت و توقیر تاریخ میں ملی ہے ، وہ کسی حوالے سے معذرت خواہانہ لب و لہجہ اور اظہار کی

متقاضی اور متحمل نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب اور سماج کو اگر ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا ہے اور سماجی زندگی کی عکاسی ادب کے دائرۂ تخلیق میں آگئی ہے تو یہ اس تحریک کا کارنامہ ہے نہ کہ کوئی ایسا عمل جو ہدف ملامت کا باعث ہو۔

ان تمام باتوں اور رویوں کے باوجود میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ادب تبلیغ، وعظ اور نصیحت کا نام نہیں۔ ادیب کا براہ راست منصب مبلغ اور مصلح کا نہیں ہوتا۔ ادب کسی اصلاحی تحریک کے لیے source of inspiration تو ثابت ہو سکتا ہے خود تحریک کا علم بردار نہیں ہو سکتا۔ علی گڑھ تحریک میں ادب کا یہی کردار رہا ہے اور اس تحریک نے فکر و شعور کی نئی جہتیں متعین کی تھیں، انھیں ادب میں رویوں اور رجحانات کے طور پر برتا گیا۔ ترقی پسند تحریک کی طرح علی گڑھ تحریک کو بھی زبردست مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جو اس کی وسعت، ہمہ گیری اور اثر پذیری کی دلیل تھی، اور یہی کچھ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی ہوا جو میرے نزدیک اس تحریک کی ہمہ گیری اور اثر پذیری پر صاد ہے۔ اگر ترقی پسند تحریک کوئی بے ضرر تحریک ہوتی تو اس کا نہ نوٹس لیا جاتا اور نہ اس کی مخالفت کی ضرورت پیش آتی۔ میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک روحِ عصر کی ترجمان تحریک تھی اور ہے۔ ترقی پسند تحریک وقت کی ضرورت اور آواز تھی اور ہے۔ ترقی پسند تحریک پر جائز اعتراضات دراصل اس کی وسعت اور پھیلاؤ کا نتیجہ تھے۔ ترقی پسند شاعری اور ترقی پسند نثری ادب جس میں افسانوی ادب شامل ہے، اگر اس کے کچھ حصے پر وہ اعتراضات صادق آتے ہیں تو ترقی پسند ادب کا ایسا وقیع حصہ بھی ہے جس پر تاریخ ادب کو ہمیشہ ناز و فخر رہے گا۔ اس بات کو میں کلیاتِ میر کے حوالے سے کہنا چاہوں گا جس کا بیشتر حصہ اربابِ نقد و نظر کے نزدیک رطب و یابس پر مشتمل ہے، مگر کلام میر کا ایک حصہ وہ بھی ہے جو اردو ادب کا لازوال اثاثہ اور میراث ہے۔ یہی بات میں بڑے اعتماد کے ساتھ ترقی پسند ادب کے حوالے سے کہہ سکتا ہوں۔

ترقی پسند تحریک بلاشبہ اردو ادب کی سب سے بڑی تحریک ہے جو علی گڑھ تحریک کی پیش رو بھی ہے اور اس کی توسیع بھی۔ علی گڑھ تحریک کی تنظیمی حیثیت زمانۂ دراز ہوا ختم ہوئی مگر اپنے آدرش کے اعتبار سے یہ جاری و ساری تحریک ہے۔ خردافروزی اور تعقل پسندی کی بنیاد جو اس تحریک نے رکھی تھی، وہ کل کی طرح آج بھی اسی قدر معنویت کی حامل ہے۔ اس طرح ساٹھ برس سے زائد کا سفرِ ارتقا طے کرنے کے بعد ترقی پسند تحریک کی معنویت میں کمی نہیں آئی ہے۔ ۱۹۳۶ء کا اس کا منشور آج بھی کلی طور پر relevant ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ قومی آزادی حاصل ہو گئی اور نوآبادیاتی تسلط سے ہم آزاد ہو گئے، مگر ہمارا معاشرہ آج بھی نئی بین الاقوامی پابندیوں اور زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، قومی آزادی کو بھی طرح طرح کی پابندیوں کا سامنا ہے۔ داخلی طور پر آزادی عام انسان کے لیے آزادیِ موہوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ معاشرے میں خردافروزی اور سائنسی طرزِ فکر و احساس کا اب بھی بڑا فقدان ہے۔ توہم پرستی، اندھی تقلید، کٹرپن، راسخ العقیدگی اور بنیاد پرستی کا آج بھی خاصا زور ہے۔ اس کے باوجود میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تیس کی دہائی کے مقابلے میں آج عالمی معاشرہ بشمول ہمارا اپنا معاشرہ بھی بہت مختلف ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کی مملکت میں اپنا سکہ چند برسوں میں تسلیم کرا لیا تھا، اور چالیس کی دہائی سے یہ تحریک order of the day کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ ترقی پسند تحریک سے اثر لینے والوں میں وہ بھی شامل ہیں جنھوں نے اس تحریک سے اختلاف کی راہ اختیار کی، مگر انھوں نے بھی ترقی پسند تحریک کی متعین حدودِ کار کی نفی کے بجائے زندگی کو ادب میں اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ برتنے اور سمونے کی روش اپنائی جو دراصل ترقی پسند تحریک کی دین ہے ورنہ اس تحریک سے پہلے ادب جس فرسودگی اور مفروضوں میں گھرا ہوا تھا، اس کی نشان دہی غیر ضروری ہے۔ اس تحریک نے ادب اور زندگی کے جو رشتے اور ناتے متعین کیے، ان سے اس تحریک کے مخالفین بھی انکاری نہیں ہو سکے۔ کچھ

معترضین ایسے بھی ہیں جن کی بیشتر نگارشات اور تحریریں ترقی پسند ادب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں اور اس کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوتی ہیں۔ اسلوب اور ہیئت کا مسئلہ ترقی پسند تحریک کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے بھی اسلوب اور ہیئت میں تجربوں کی تائید اور حمایت ترقی پسندوں کی ترجیحات میں شامل رہی ہیں۔ ترقی پسند قلم کاروں نے اس باب میں کبھی منفی رویے کو مستحسن نہیں جانا۔

خود تنقیدی کے ذیل میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کچھ ترقی پسند ادبا نے اپنی فکر اور اپنے نظریے کو dogma کا درجہ دیا اور اس پر راسخ العقیدگی کے ساتھ قائم رہنے کو ترقی پسندیت سمجھ بیٹھے اور قانون ارتقا، جو دراصل تغیر و ترقی کا عمل مسلسل ہے، سے اپنی بے خبری کا ثبوت فراہم کیا۔ ترقی پسندیت قانون ارتقا سے ماخوذ ہے، لہٰذا اس فکر کے رکھنے والوں کے یہاں اندھی تقلید اور منجمد سوچ کے لیے کوئی گوشہ نہیں ہونا چاہیے۔

ترقی پسند تحریک کو ایک انقلاب کا درجہ حاصل تھا۔ اس انقلاب نے اپنے پہلے عشرے میں اپنے بیشتر اہداف حاصل کر لیے تھے اور بطورِ انقلاب اس کا کردار اور رول مکمل ہو چکا تھا، لہٰذا اس کی تنظیمی شکست و ریخت منطقی بات تھی۔ ویسے بھی زندگی اور تاریخ و تمدن کے دریائے بے کنار کو زیادہ دور تک کسی بند کا پابند نہیں رکھا جا سکتا اور جس انقلاب نے انقلابِ مسلسل بنے رہنے کی کوشش کی، وہ انقلاب کریش کا شکار ہو گیا۔ انقلابات کی عمرِ طبعی زیادہ نہیں ہوتی، مگر ان انقلابات کی روح محرکہ اور اس کا آدرش ہمیشہ زندہ و پائندہ رہتا ہے۔ انقلابِ فرانس کی مثال اس حوالے سے بڑی بامعنی بنتی ہے۔ ۱۹۱۷ء کا انقلابِ اکتوبر تو خیر تاریخ کا سب سے ہمہ گیر، ہمہ جہت اور اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے اعتبار سے سب سے عظیم انقلاب ہے۔ سوویت یونین کے کالعدم ہونے سے نہ تو اس کی تاریخی اہمیت کم ہوئی ہے اور نہ اس کے آدرش کی عظمت و توقیر میں کمی آئی ہے۔ ترقی پسند تحریک کو بھی اگر انقلاب کے طور پر دیکھا جائے تو میں

اس رائے سے اتفاق کرنے کو تیار ہوں کہ اس انقلاب نے اپنا رول ادا کر دیا، مگر میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا جو اس انقلاب کی روح محرکہ سے انکار پر مبنی ہے۔ ترقی پسند تحریک جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، گزشتہ پانچ دہائیوں سے order of the day ہے۔ یہ تحریک آج بھی روح عصر کی ترجمان ہے اور یہ ترجمانی اس کا ہمیشہ منصب اور استحقاق رہے گا۔ ترقی پسند تحریک کی وسعت و ہمہ گیری کسی تنظیم کی ضرورت سے ایک عرصۂ دراز سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ ویسے بھی ادیب کو کسی سیاسی جماعت کے نقش قدم پر کسی ادبی تنظیم کے discipline کا پابند نہیں کیا جا سکتا اور نہ تخلیقی عمل اس قسم کے discipline اور intellectual regimentation کا متحمل ہو سکتا ہے۔

اس روشنی میں جب میں ان سوالات پر غور کرتا ہوں جو ڈاکٹر قمر رئیس نے اٹھائے ہیں تو چند واضح باتیں میرے پیش نظر ہیں۔ ایک بات مجھے جناب سبط حسن کی یاد آرہی ہے جو وہ بار بار کہتے تھے کہ ترقی پسند اہل قلم نے قلم سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے یا کمزور کر لیا ہے۔ سو یہ نکتہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ کانفرنسوں اور سیمیناروں کے انعقاد سے تخلیقی عمل کو اگر نقصان پہنچے اور بات جلسے اور میلے کے انعقاد تک محدود ہو کر رہ جائے تو یہ بات یقیناً پسندیدہ نہیں کہی جائے گی، لہذا ڈاکٹر قمر رئیس جیسے ترقی پسند stalwarts اگر زیادہ وقت لکھنے پڑھنے پر صرف کریں اور اپنی تحریروں اور نگارشات سے ترقی پسند ادب کے خزینے میں اضافہ کریں تو لوگوں کا یہ اعتراض خود بخود رد ہو جائے گا کہ ترقی پسند ادبا ہنگامہ آرائیوں میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں اور ادب تخلیق کرنا ان کی اولین ترجیح نہیں ہے۔ تنظیمی ذمے داریاں، کانفرنسوں اور سیمیناروں کے انعقاد کی ذمے داریاں نوجوان ادیبوں کو سونپ دی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

نظریاتی سطح پر بھی آج ترقی پسندیت کا دائرۂ کار بہت وسیع ہو گیا ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی شعور کا سفر پیش رفت کا سفر رہا ہے۔ آج کرۂ ارض

سائنسی اور تکنیکی ترقیوں اور معجزوں کے باوصف اس قدر سمٹ (shrink) کر رہ گیا ہے کہ اب sectarianism کے لیے بہت کم گنجائش باقی ہے ۔ زندگی تمام تر پھیلاؤ کے ساتھ ادب کا آج موضوع بن چکی ہے ، لہٰذا زندگی کی وسعتوں کو سمیٹنے کے لیے کسی فارمولے ، کسی منشور یا بوطیقا کی اب ضرورت نہیں رہی ہے ۔ یہ اچھی بات ہے کہ گزشتہ عشرے میں ہونے والی بیشتر کانفرنسوں ، مجالسِ مذاکرہ اور سیمیناروں میں مختلف مکاتبِ فکر کے ادیبوں اور دانش وروں کو شرکت کی دعوت دی گئی اور اعلان ناموں اور نئے منشور کی منظوری سے گریز کیا گیا ہے ۔ یہ رویہ عصری زندگی کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور ترقی پسندیت کو نئے تناظر میں نئے امکانات سے ہم آہنگ رکھنے کی سمت میں صحیح سفر قرار پائے گا ۔

اگست ، ۱۹۹۵ء

# ادب اور جمہوریت

# جمہوری آدرش

"جمہوریت سیاست دانوں کی ضرورت ہے مگر ہم ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور دانش وروں کی ضرورت بھی اور آدرش بھی" ۔ یہ ابتدائی فقرہ اس بیان سے ماخوذ ہے جو سہ روزہ کل پاکستان جمہوریت پسند مصنفین کنونشن، منعقدہ لاہور، مارچ ۲۹ تا ۳۱ میں ملک کے تقریباً تین سو ادیبوں، دانش وروں اور فن کاروں نے متفقہ طور پر منظور کیا تھا ۔ اس کنونشن کا انعقاد ادیبوں اور دانش وروں کا جمہوری اقدار، جمہوری عمل اور جمہوری آدرش سے کمٹمنٹ کا اجتماعی اظہار تھا ۔

ملک کے ادیب اور دانش ور جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے اپنی تخلیقات و نگارشات کے ذریعے عملاً معاشرے کے دوسرے جمہوریت پسند حلقوں اور طبقوں کے شریکِ سفر رہے ہیں اور بعض مرحلوں میں رہ نمایانہ کردار بھی ادا کیا ہے ۔ ادیبوں اور فن کاروں نے فکر و خیال کی آزادی کی تحریک میں جو عظیم خدمات انجام دی ہیں، وہ ہمارا قابلِ فخر ورثہ ہے ۔ اظہارِ خیال کی آزادی اور دیگر شہری آزادیوں کا تحفظ اور جمہوری عمل کی کامیابی کا مسئلہ ادیب اور عوام، دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے ۔ جب عوام کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنے تجربے کی روشنی میں آزادی کے ساتھ اپنی

اجتماعی ترقی کا راستہ ڈھونڈیں اور آزادی سے اس راستے پر چلیں تو سماج میں وہ تخلیقی قوتیں فروغ پاتی ہیں جن سے ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک حاصل ہوتی ہے اور جن کے فن کارانہ اظہار سے ہماری کاوشیں تخلیق بن جاتی ہیں۔ ادیبوں کو اپنے ضمیر اور فکر کے مطابق لکھنے اور بولنے کی آزادی حاصل ہو تو وہ اپنی سماجی زندگی کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں اور اپنی ادبی تخلیقات کی مدد سے زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ادیب کی جمہوری عمل سے غیر معمولی اور پرجوش وابستگی اور والہانہ لگاؤ ناقابل فہم نہیں ہے، کیونکہ اس کے نزدیک جمہوریت شرفِ انسانیت کی ضمانت ہی نہیں، معاشی اور سیاسی سطح پر اس جدلیاتی حرکت کا نام ہے جس کے ذریعے ہمارا سماج کلی طور پر ناقابل دفاع ماضی میں رہنے کے بجائے حال میں زندہ اور مستقبل میں تابندہ اور پائندہ رہ سکتا ہے۔ جمہوریت قانون کی حکمرانی اور اختلافِ رائے کے حق کے احترام کی علم بردار ہے۔ جمہوریت اپنی تمام تر کوتاہیوں سے قطع نظر شائستگی، وقار، سلیقہ مندی اور رکھ رکھاؤ کی پاس دار ہے۔ اس کے برخلاف آمرانہ حکومت یا مارشل لا، لاقانونیت کا حامل نظام ہے اور ان تمام اقدار اور معیارات کی نفی کرتا ہے جن میں جمہوریت یقین رکھتی ہے۔

ادیب کا جمہوری آدرش سے ناتا روح اور جسم کے رشتوں کی طرح ہے، کیونکہ حریتِ فکر و نظر کا بلاشرکتِ غیرے گہوارہ، جمہوریت ہی ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ادیب برادری نے ہر مرحلے پر جمہوری عمل اور جمہوریت کے سفر کا خیر مقدم کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ۱۷ نومبر، ۱۹۸۸ء سے جمہوری عمل کے آغاز کو ادیبوں نے پرجوش انداز میں خوش آمدید کہا اور اس کی کامیابیوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پوری سرگرمی کے ساتھ دستِ تعاون دراز کیا، اپنی تخلیقات میں نئے عہد کا خیر مقدم کیا اور عملی میدان میں سرگرم عمل ہو گئے۔ ابتدائے سفر سے جمہوریت کے کارواں کو جو دشواریاں اور

مشکلات درپیش ہیں اور جو اس کے محدودات ہیں ، ادب برادری ان کا مکمل ادراک رکھتی ہے۔

قافلۂ جمہوریت کے موجودہ سفر کو ایک سال بیت چکا ہے۔ یہ سفر کچھ زیادہ خوش گوار نہیں رہا ہے بلکہ کسی حد تک مایوس کن تھا۔ اس عرصے میں عوام کو جو کم از کم توقعات تھیں ، وہ بھی شاذ ہی پوری ہوئیں۔ ایک روشن خیالی کی لہر کے علاوہ کوئی اور احساس بیدار نہیں ہو سکا۔ منفی رجحانات کی بیخ کنی برائے نام ہوئی اور بنیاد پرستی کی ڈگر سے معاشرے کو دور کرنے کا عمل ہنوز ناپید ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اس شعبے میں جو کارکردگی ہونا چاہیے تھی ، وہ اب تک غیر موثر نظر آتی ہے۔ ان تمام کمزور پہلوؤں کے باوجود جمہوری عمل کی طرف سے بے توجہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوریت ادیبوں کے خمیر میں شامل ہے۔ وہ اس کا پرچم ہمیشہ بلند رکھیں گے۔

مذکورہ کنونشن کے بیان میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا تھا کہ ابھی جمہوریت کے پودے نے پوری طرح جڑیں نہیں پکڑی ہیں۔ اس کے پروان چڑھنے کے لیے جمہوریت دوست سیاست دانوں ، ادیبوں ، شاعروں اور دانش وروں پر نئی ذے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس ادراک کا اظہار بھی کیا گیا کہ اس وقت تک ملک میں جمہوریت کا ثبات خواب ہی رہے گا جب تک کہ عالمی سامراج کے معاشی ، سیاسی اور ثقافتی تسلط سے مکمل طور پر آزادی حاصل نہیں ہو جاتی اور بنیادپرستی اور طاقت کی بالادستی کے نظریے کا پوری طرح توڑ نہیں کر دیا جاتا۔ جمہوریت عصر جدید کی شناخت ہے اور آج کی دنیا کے لیے ایک جامع نظریہ اور فلسفۂ حیات کا درجہ اختیار کر چکی ہے ، چنانچہ مشرقی یورپ کی سیاسی ہلچل بھی اس حقیقت کی غماز ہے۔

جمہوریت ایک سیاسی اور سماجی نظام کے علاوہ ایک طرزِ احساس بھی ہے۔ جمہوری رویہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک طرف معقولیت کی سند متصور ہوتا ہے تو دوسری طرف رواداری اور روشن خیالی کا معیار بھی۔ جمہوریت کے بغیر ادب کی صحت مند قدروں کا فروغ خام خیالی ہے۔

دسمبر ۱۹۸۹ء

# ادب اور جمہوری شعور

پیامِ درد بھی ، تاباں ! بہت غنیمت ہے
نہ جانے دل کی کبھی پھر خبر ملے ، نہ ملے

یہ شمارہ محترم جناب غلام ربانی تاباں مرحوم سے موسوم ہے جن کا انتقال ۷ فروری ، ۱۹۹۳ء کو دہلی میں ہوا۔ مارچ کے شمارے میں اداریے کے ذریعے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاچکا ہے۔ اس شمارے میں ایک خصوصی گوشے کے ذریعے ان کے ادبی مرتبے اور منصب کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مذکورۂ بالا اداریے میں ان کے آدرش ، نصب العین اور مشن کے حوالے سے گفتگو کی گئی تھی۔ گزشتہ مہینے برصغیر کے لیے غیر معمولی مہینے رہے ہیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے ملک کے لیے ۔ جمہوری اقدار کی پاس داری تاباں صاحب کی شخصیت اور فکر و فن کی اساس اور ان کے لیے قوتِ متحرکہ کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ اپنے ملک کے جمہوری عمل میں سیکولر فکر و نظر کی پسپائی اور فقدان کے نتیجے میں احیا پرستی کے روز افزوں فروغ پر بہت دل گرفتہ تھے اور اپنی زندگی کے آخری عشرے انھوں نے منفی تحریکوں کے خلاف جدوجہد کرنے میں صرف کیے اور اپنی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کو اس عرصے میں

پس پشت ڈالے رکھا۔ ہندوستانی معاشرے میں جمہوری ادارے یقیناً مستحکم ہوئے مگر سیکولرزم، جو روحِ جمہوریت ہے، کی بتدریج نفی ہوتی گئی اور مذہبی جنون اور توہم پرستی پروان چڑھتی رہی، نتیجے کے طور پر ہندوستان میں جمہوریت جسدِ بے روح ہوتی جارہی ہے۔ وہاں کی معاشرتی زندگی اعلیٰ جمہوری روایات کے فیوض و برکات سے بہرہ ور ہونے کے بجائے عدم رواداری، راسخ العقیدگی (obscurantism) اور فرقہ وارانہ جنون کے عفریت کی خونی گرفت میں آتی جارہی ہے۔ پاکستان میں یہ صورتِ حال اور بھی دگرگوں ہے۔ یہاں جمہوری ادارے اور جمہوری روایات و اقدار یکساں طور پر ترقیِ معکوس کے سفر پر گام زن ہیں اور ہم ہنوز روزِ اول کے سفر کو دہراتے رہے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں خصوصیت کے ساتھ ہمارے معاشرے میں تشدد اور عدم رواداری اور لسانی اور نسلی منافرتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں فسطائی رجحانات و عناصر کا عمل دخل تشویش ناک حد تک بڑھا ہے جن سے جمہوری روایات اور اداروں کو، جو پہلے ہی بہت کمزور ہیں، نئے خطرات درپیش ہیں۔ ان تلخ حقائق کے پیش نظر ضروری ہوگیا ہے کہ ادیبوں اور دانش وروں کی توجہ اس بحران کی طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک دفعہ پھر مبذول کرائی جائے تاکہ جمہوریت کو درپیش تازہ ترین خطرات سے نپٹنے کے لیے قلم کی طاقت بروئے کار لانے کی سعی مشکور از سرِ نو کی جائے۔ آج کی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس شدید تر ہوگیا ہے، کیونکہ ہماری سیاسی قیادت نے گویا روایتی جمہوریت دشمن قوتوں سے ساز باز کرلی ہے یا پھر ان کے سامنے سپر ڈال دی ہے۔ سیاست سے نصب العین اور آدرش کا اخراج ہوگیا ہے اور موقع پرستی اصولِ سیاست ٹھہری ہے۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

اس صورتِ حال میں میرے نزدیک اہلِ دانش اور قلم کاروں کی ذمے داریاں

بہت بڑھ گئی ہیں جن سے روگردانی ممکن نہیں، کیونکہ معاشرے کے لیے فلاح اور نجات کا واحد راستہ جادۂ جمہوریت ہے۔ آج جمہوریت کی اہمیت اور ناگزیریت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس موضوع پر کچھ زیادہ توجہ مرکوز کی جائے۔

جمہوریت عصرِ جدید کی شناخت ہے اور آج کی دنیا کے لیے ایک جامع عقیدہ اور فلسفۂ حیات کا درجہ اختیار کر چکی ہے، ایک ایسا عقیدہ جو زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے اور سماج کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ جمہوریت آج ایک سیاسی اور سماجی نظام کے علاوہ ایک طرزِ احساس بھی ہے اور ایک نظامِ فکر بھی۔ جمہوری رویہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک طرف معقولیت کی سند تصور کیا جاتا ہے تو دوسری طرف رواداری اور روشن خیالی کا معیار۔ جمہوری مزاج کی عدم موجودگی ایک معاشرے کی پس ماندگی کا اظہار کرتی ہے۔ جمہوری روایات و اقدار کی پاس داری عین شرفِ آدمیت کی پاس داری ہے۔ جمہوریت کی جامعیت اور وسعت کا تعین کرنے کے لیے کتنے ہی سابقے اور لاحقے ضبطِ تحریر میں لائے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً بالواسطہ جمہوریت، بلاواسطہ جمہوریت، صدارتی جمہوریت، پارلیمانی جمہوریت، وحدانی جمہوریت، وفاقی جمہوریت، عوامی جمہوریت، قومی جمہوریت، سوشلسٹ جمہوریت، جمہوری مرکزیت، اقتصادی جمہوریت، خالص جمہوریت وغیرہ۔ غرض یہ کہ جمہوریت کی ہمہ گیری اور اس کے مختلف نظری اور عملی پہلوؤں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جن سابقوں اور لاحقوں کے حوالے سے جو مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کیے گئے ہیں، ان کا مطالعہ ذہنوں کو جلا بخشنے کے لیے ناگزیر ہے۔

جمہوریت کی مقبولیت آج اس منزل میں ہے کہ جمہوریت دشمن عناصر جمہوریت دشمنی کا فریضہ انجام دیتے وقت بھی جمہوریت کا کلمہ پڑھتے ہیں اور اپنی جمہوریت دشمنی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے مختلف النوع اصطلاحوں کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پابند جمہوریت، محدود جمہوریت، بنیادی جمہوریت، اسلامی جمہوریت

اور شورائی جمہوریت جیسی اصطلاحات ان ہی مقاصد اور مطمحِ نظر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس صدی کے بدترین آمروں کو بھی جمہوریت کو بالاعلان مسترد کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، بلکہ انھوں نے خود کو جمہوریت کا بڑا اور حقیقی چیمپین اور محافظ کہہ کر رائے عامہ کو دھوکا دینے اور گمراہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ ہمارے ملک میں گزشتہ چار دہائیوں کے دوران جمہوریت کی بیخ کنی کرنے والے طالع آزماؤں نے ان ہی ہتھکنڈوں اور اصطلاحی بازی گری کا حربہ آزمایا اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے، کیونکہ عوام کو بے شعور گردان کر ان کو فریب دینے والوں کو تاریخ نے کبھی سرخرو ہونے کا موقع نہیں دیا بلکہ ہمیشہ اپنا فیصلہ دو ٹوک انداز میں صادر کرکے ان کو مردودِ بارگاہِ آدمیت قرار دیا۔

جمہوریت دراصل انسانی معاشرے میں ہزاروں سال سے ہونے والے معرکۂ خیر و شر میں خیر کی فتح کی امین ہے، کیونکہ جمہوریت کی تین بنیادیں "آزادی، مساوات اور اپنی حکومت آپ" گویا وحدتِ انسانیت اور مساوات کے اعلان نامے کا درجہ رکھتی ہیں۔ جہاں سماج میں پائی جانے والی ہر تمیز و تفریق کی جمہوریت نفی کرتی ہے، اس کے ساتھ ان تمام نظریات و عقائد، تصورات و افکار اور مفروضوں کو بھی رد کرتی ہے جن سے سماج میں نابرابری اور تمیز و تفریق کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ جمہوریت عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کی علم بردار ہے۔ جمہوریت رنگ و نسل، زبان و ثقافت، مذہب و جنس، کسی اعتبار سے انسانوں کے درمیان تمیز و تفریق کے کسی استدلال کو قبول نہیں کرتی بلکہ ان تمام تنگ نظریوں، تعصبات اور شاونزم کو، جو کسی سماجی ناانصافی اور نابرابری کا جواز فراہم کرتا ہو، ذہنی کج روی، گمرہی اور باطل قرار دیتی ہے۔ نائب اللہ، ظلِ سبحانی اور اس قسم کے آسمانی حوالوں سے حکمرانی کے حق کا دعویٰ کرنے والے اب دنیا میں نہیں ہوں گے۔ اگر کسی نے یہ شوق چرایا تو اس کو شرمندگی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر

جمہوری آدرش کی توثیق کی ایک اہم دستاویز ہے اور تاریخ میں انسانی مساوات کی اصولی فتح کا روشن ترین باب ہے۔ حقوقِ انسانی کے اس چارٹر پر دستخط کرنے والوں میں وہ افراد اور عناصر بھی شامل ہیں جو دراصل اس کے مخالف ہیں، مگر ان سے انکاری ہونا اب ان کے بس کی بات نہیں۔

ادب کا جمہوری آدرش اور جمہوری شعور سے ناتا روح اور جسم کے رشتوں کی طرح ہے۔ حریتِ فکر کا بلا شرکتِ غیرے گہوارہ، جمہوریت ہی ہے۔ اظہارِ رائے کی آزادی اس کی تخلیقی سرگرمیوں کا سرچشمہ قرار پا سکتی ہے۔ اس حق کے لیے ادب روزِ اول سے سرگرداں اور نبرد آزما ہے۔ بیسویں صدی میں ادیبوں نے جمہوری آدرش کے لیے صرف اپنے قلم سے جہاد نہیں کیا بلکہ اس کے تحفظ کے لیے میدانِ کارزار میں اپنی جان کے نذرانے بھی پیش کیے۔ ۱۹۳۳ء میں یورپ میں فسطائیت کے فتنے نے سر اٹھایا اور تہذیب و تمدن اور جمہوری اقدار کو حقیقی خطرات درپیش ہوئے تو ادیبوں نے بین الاقوامی پیمانے پر صدائے احتجاج بلند کی اور فسطائیت کے خلاف اپنی صف آرائی کی۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس کے مقام پر کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی کانگرس بلائی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب دنیا کے وہ سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہو گئے جو جمہوریت، روشن خیالی، انسان دوستی اور ترقی پسندیت میں یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کانفرنس میں یہ طے کیا کہ ادیب و شاعر کو اپنے ذاتی نہاں خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب ثقافت کی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے جمہوریت دشمن، رجعت پسند طاقتوں کے مدِمقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اس موقع پر ادیبوں کے نام جو اپیل شائع کی گئی، اس میں کہا گیا:

"رفیقانِ قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہم نوائی کیجیے۔

ہمارا قلم ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں، روپے کے بل پر حکومت

کرتی ہیں، جو کارخانے داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں"۔

ہماری قومی تاریخ کے چھیالیس سال کا بیشتر دور جمہوریت دشمن اقتدار کا دور رہا ہے۔ ملک میں جاگیر دار، نوکر شاہی اور دیگر مراعات یافتہ طبقات اپنے غیر جمہوری اقتدار اور لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو دوام بخشنے کے لیے پاکستانی عوام کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم رکھنے کی سازشوں میں روزِ اول ہی سے مشغول رہے ہیں، جبکہ ملک کی ترقی پسند جمہوری قوتیں ایسی مکروہ سازشوں کو طشت از بام کرنے اور جمہوری اقدار کے تحفظ اور انسانی وقار کی بحالی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتی رہی ہیں۔ ان مصروف پیکار طاقتوں میں عوام دوست ادیب پوری تن دہی کے ساتھ شاملِ عمل رہے ہیں جن کی پاداش میں طرح طرح کے مصائب و آلام سے گزرنا ایک قدرتی امر تھا۔ دارو گیر اور قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ ایسے ادیبوں پر معاش کے دروازے بھی بند کیے گئے، ان کی تصانیف، رسائل و جرائد پر نہایت تواتر کے ساتھ پابندیاں عائد کی جاتی رہیں۔ حکومتی حلقوں کے باہر ان کے حلیف، مفاد پرست، موقع شناس اور تنگ نظر نام نہاد دانش ور عوام دوست ادیبوں کے خلاف نت نئے اتہام تراشنے اور دشنام طرازی میں مصروف رہے ہیں۔ وہ گمراہ کن نعروں کے ذریعے ترقی پسند ادیبوں کو پاکستانی معاشرے میں فعال کردار ادا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن وہ ان تمام مراحل سے سرخرو و کامران گزرے۔ ادب اور ریاستی وفاداری کے حوالے سے وہ اپنی تحریروں میں اس عزم کا بار بار اعادہ کرتے رہے ہیں کہ ہم ریاست سے وفاداری کو عوام سے وفاداری کے پیمان کو مشروط کرتے ہیں نہ کہ حکومتِ وقت کی کاسہ لیسی سے۔

پاکستان کے عوام دوست ادیبوں، دانش وروں اور فن کاروں نے عوام کے

رنج والم اور ان کی محرومیوں سے آگاہی کو اپنی تحریروں کا نقطۂ ارتکاز بنایا، عوامی امنگوں کی ترجمانی کی، فوجی آمریت کے ادوار میں جمہوری تحریک اور عوامی جدوجہد میں وہ ان کے ساتھ رہے اور اپنی تخلیقات کی کہکشاں ان کی آرزوؤں اور تمناؤں سے سجاتے رہے۔ ان ادیبوں نے سماجی شعور کے ارتقا اور معاشرتی تقاضوں کا بھرپور اظہار کیا ہے اور ادب میں سائنسی نقطۂ نظر، جمہوری اقدار اور انسان دوستی کو فروغ دیا ہے۔ انھوں نے ادب میں قنوطیت، انفعالیت، قدامت پرستی، مقدر پرستی اور زندگی کو فریب محض سمجھنے کے تصورات کو مسترد کیا اور اس طرح ادب اور زندگی کے رشتے کو تصوری طور پر واضح کیا۔ ہمارے ملک کے باشعور ادیبوں نے مغربی استعمار کے آوردہ اور پروردہ خطرناک رجحانات مثلاً ہیئت پرستی، سریت، حیوانیت، فحش نگاری، جنسی انتشار پسندی، ابہام پسندی، رہبانیت وغیرہ کو بے نقاب کیا۔ یہ ادیب ادب کو زندگی کا ترجمان اور معمار سمجھتے ہوئے زندگی کو خوب صورت تر دیکھنے کے خوابوں کی تعبیر پیش کرتے رہے۔ ہمارے ادیبوں اور فن کاروں نے جمہوریت کی ترقی اور فکر و خیال کی آزادی کی جدوجہد میں جو عظیم خدمات انجام دیں ہیں، وہ ہمارا قابلِ فخر ورثہ ہیں۔ شہری آزادیوں کا تحفظ اور جمہوری عمل کی کامیابی کا مسئلہ ادیب اور عوام، دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ جب عوام کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنے تجربے کی روشنی میں آزادی کے ساتھ اپنے لیے اجتماعی ترقی کا راستہ ڈھونڈیں اور آزادی سے اس راستے پر چلیں تو سماج میں وہ تخلیقی قوتیں فروغ پاتیں ہیں جن سے ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک ہوتی ہے اور جن کی فن کارانہ ترجمانی سے ہماری کاوشیں نئی تخلیق بن جاتی ہیں، اور اس کے ساتھ ادیبوں کو اپنے ضمیر اور فکر کے مطابق لکھنے اور بولنے کی بھرپور آزادی حاصل ہو تو ہم اپنی سماجی زندگی کی صحیح ترجمانی کرسکتے ہیں اور اپنی ادبی تخلیقات کی مدد سے زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

کچھ لوگ شبِ غم کی سحر ڈھونڈ رہے ہیں
شوریدہ مزاجی نہیں، تاباں! تو یہ کیا ہے؟

جمہوریت کا پودا ہمارے یہاں شروع سے ہی صرصر و سموم کی زد میں ہے۔ اسے پنپنے اور پھلنے پھولنے کا ماحول اور فضا اکثر و بیشتر میسر نہیں رہی، چنانچہ معاشرہ جمہوریت کے ثمرات سے یکسر محروم ہے۔ کچھ حلقے جمہوریت کو محض ایک سیاسی نظام اور نظامِ حکومت جان کر اپنے ملک میں اس کی ناکامیوں اور اربابِ حل و عقد کے ہاتھوں اس کی بے بسی کا رونا رو کر سرے سے جمہوریت کے نظریے کی نفی کرنے لگے ہیں۔ کچھ حلقوں نے اپنے مسائل کے لیے جمہوری عمل کو دوراز کار جان کر فسطائی سیاست کی راہ اپنائی۔ تشدد اور کشت و خون کی عمل داری انھیں دہشت گردی کی دہلیز تک لے آئی ہے اور اب تک جو نتائج سامنے آئے ہیں، ان سے سوائے شرمندگی اور مایوسی کے معاشرے کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ نقصانات جو ہوئے، وہ ناقابلِ بیان ہی کہے جاسکتے ہیں۔ کچھ حلقے ایسے بھی ہیں جو صدیوں پرانے تجربات کو دہرانے اور ماضی بعید کے سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کے احیا کی بات کرتے ہیں اور سماجی ارتقا کے قوانین اور تغیر و تبدل کے ضوابط سے قطعی نابلد اور بے بہرہ ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ابتدائی سطور میں جمہوریت کی تعریف و تفسیر بیان کرتے ہوئے یہ بات کہی گئی ہے کہ جمہوریت ایک سیاسی فلسفے، نظریے اور نظام کے علاوہ ایک طرزِ فکر و احساس، طرزِ معاشرت اور نظامِ زندگی کا درجہ رکھتی ہے۔ جمہوریت کا آدرش شرفِ بشر سے عبارت ہے، مساوات و آزادی سے عبارت ہے۔ جمہوریت ہر قوم کے امتیاز و تفریق کی نفی کرتی ہے۔ کوئی معاشرہ جو انسانی آبادی میں کسی پیمانے اور معیار سے انسانوں کے درمیان امتیاز و تفریق کرتا ہے، وہ معاشرہ جمہوری کہلانے کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ یہ کہنا ناگزیر ہے کہ سیکولرزم اور جمہوریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور بغیر

سیکولر اصولوں کو اپنائے ، جمہوری حکومت اور نظام کا تصور نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ سیکولرزم کے اصولوں کی پاس داری سے ہی کسی معاشرے کے تمام شہریوں کی مساویانہ حیثیت کا تعین ممکن ہے۔ کسی تفریق اور امتیاز کے ہوتے ہوئے جمہوری نظام کا دعویٰ غلط اور گمراہ کن ہے، اگر تمام شہری یکساں حقوق و مراعات نہیں رکھتے مذہبی بنیادوں پر تفریق اور امتیازی سلوک روا رکھا جانا جمہوریت کی نفی ہے۔

جمہوریت ہمارے یہاں ہمیشہ آزمائشوں سے دوچار رکھی گئی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ جمہوریت ہمارے یہاں ہمیشہ سرِ دار رہی ہے اور بار بار اسے پھانسی دی گئی ہے مگر یہ بڑی سخت جان واقع ہوئی ہے، اور بات کچھ دوسری بھی ہے کہ جمہوریت کا دراصل کوئی نعم البدل (substitute) ہے ہی نہیں۔ کوئی معاشرہ جادہ جمہوریت ترک کرکے نہ تو محفوظ راستوں میں سفر کرسکتا ہے اور نہ معاشرے کے لیے فلاح و ترقی کی منزلیں ڈھونڈ سکتا ہے۔ جمہوریت کا سفر صبر آزما سفر ہے، کیونکہ جمہوریت کے سفر کا کوئی short cut بھی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں پوری معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی غیر یقینیت کا شکار رہی ہے اور یہ غیر یقینیت آج کچھ سوا نظر آرہی ہے۔ یہ غیر یقینیت جمہوری عمل سے روگردانی کا لازمی نتیجہ ہے۔ معاشرے کے ہر طبقے کا مفاد جمہوریت سے وابستہ ہے اور یہی سب کے لیے نجات اور فلاح کا راستہ ہے، لہٰذا جمہوریت کے پودے کی آبیاری سب کا فریضہ بنتا ہے۔ ادیبوں اور دانش وروں کے لیے جمہوریت سب سے بڑی ضرورت ہے کہ بغیر جمہوریت کے وہ ادب کے آفاقی اقدار کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ غیر جمہوری معاشرے میں گھٹن اور جبر کے نتیجے میں تخلیقیت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ غیر جمہوری معاشرہ دراصل غیر صحت مند معاشرہ ہوتا ہے، لہٰذا غیر صحت مند معاشرے میں فکر و احساس میں پراگندگی اور منفی رجحانات کا پیدا ہونا منطقی بات ہوتی ہے۔

آج جمہوریت کو غیر یقینیت اور دوسرے challenges کا سامنا ہے۔ قلم کاروں کا فرض ہے کہ وہ اسے مقدس جہاد جان کر اپنے قلم سے جمہوری اقدار و روایات کے فروغ کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کریں:

راہوں کے پیچ و خم میں سمتیں بھی کھو گئیں
دشوار مرحلہ ہے، تاباں! ذرا سنبھل کے

اپریل، ۱۹۹۳ء

# سیکولرزم اور جمہوریت

سال گزشتہ کے آخری ایام میں برصغیر کی سیاسی اور سماجی فضائیں ایک بار پھر اس درجہ کثیف اور غبار آلود ہو گئیں کہ انسانی چہرہ دھندلا نظر آنے لگا، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ انسانی چہرہ فضا میں پائی جانے والی کثافت اور آلودگی میں وقتی طور پر ہی، کلیتہً گم ہو گیا ہے ۔ پورے برصغیر میں وحشت و بربریت کی کہانیاں دہرائی جانے لگیں، معاشرہ فرقہ وارانہ فساد زدگی کی لپٹ میں آگیا اور کشت و خون کا بازار گرم ہوا۔ فرقہ واریت کے عفریت نے نہایت ہیبت ناک انداز میں سر ابھارا اور اپنی ہوس ناکیوں کی پیاس انسانی خون سے بجھائی اور تہذیب و تمدن کا تقدس پامال کر کے ثقافتی اور تہذیبی ورثے اور روایات کی تذلیل و تکذیب کی اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ یہ المیہ ایسا ہے جس پر اہل فکر و نظر کو غور و فکر ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے عوامل کا تجزیاتی جائزہ لینا چاہیے اور اس المیے کے نتیجے میں معاشرے میں جو تاریکی پھیلی ہے، اسے دور کرنے کی سنجیدگی کے ساتھ کوشش بھی کرنا چاہیے ۔

متذکرۂ بالا المیے کی ابتدا ۶ دسمبر، ۱۹۹۲ء کو سانحۂ اجودھیا سے ہوئی ہے جو ہر

آنے والے دن کے ساتھ سنگین تر ہوتی گئی ہے۔ پاکستان میں اس کے ردِ عمل میں جو کچھ ہوا ہے، وہ بھی اس المیے کا کم اہم حصہ نہیں ہے۔ یہاں ہونے والے واقعات پر اہلِ دانش اور اہلِ سیاست یکساں طور پر دکھی ہوئے اور مخصوص بنیاد پرست حلقوں کے سوا معاشرے نے مجموعی طور پر ان حادثوں کو مجرمانہ اور پاکستانی معاشرے اور ساکھ کے منافی قرار دیا ہے۔

ہندوستانی مسلم آبادی اس المیے کے وقوع پذیر ہونے سے زبردست صدمات سے دوچار ہے۔ بابری مسجد کے انہدام اور اس کے بعد ہندوستان کے دو سو سے زیادہ شہروں اور قصبوں میں سنگین پر تشدد واقعات، پولیس اور فرقہ پرستوں کی بربریت اور درندگی نے جہاں معاشرے کے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، وہاں کچھ بنیادی سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ موقر ہم عصر جریدے 'روشن خیال' کراچی کے تازہ شمارے میں "ہندوستانی مسلمان .... حال اور مستقبل" کے حوالے سے ایک خصوصی رپورٹ شائع ہوئی ہے اور سرورق پر دل و ذہن میں ارتعاش پیدا کر دینے والی تصویر شائع کی ہے۔ اس خصوصی رپورٹ کے تیسرے اور آخری مضمون میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب سید حامد نے "اجودھیا کے بعد کیا؟" کے زیرِ عنوان فرقہ پرستی کے جنون کا تجزیہ کرتے ہوئے ان خیالات کا احاطہ کیا ہے جو اس المیے کے پیدا کردہ ہیں۔ "کیا تعداد کو قانون پر بالادستی حاصل ہو گئی ہے؟ کیا اکثریت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اقلیت کو روندتی چلی جائے، آئین کو بالائے طاق رکھے، قانون کی دھجیاں بکھیر دے، عدالتوں کی حکم عدولی برملا اور علی الاعلان کرے؟ کیا سارے ملک میں حکومت جمہوریت کی نہیں، اکثریت کی ہے؟ اور اقلیت اکثریت کی رعایا ہے اور اس کے رحم و کرم پر یہاں زندگی گزار رہی ہے؟ کیا رواداری کی روایت ایک سراب ہے؟ کیا سیکولرزم کا دعویٰ فریب ہے؟ کیا ہندوستان ایک مذہبی ریاست ہے؟" ..... یہ وہ چند سوال ابھرے ہیں جن پر تفکر کرنا ناگزیر ہے اور ان

سوالات کی صدائے بازگشت ادب میں موثر انداز میں سنائی دینی چاہیے۔

میرے نزدیک ۶ دسمبر کے المیے اور اس کے بعد ہونے والے انسانیت کش واقعات دراصل ہندوستانی معاشرے کے خلاف ایک سازش کا درجہ رکھتے ہیں، یہ آزاد ہندوستان کے چہرے کو مسخ کرنے کی ایک مہم تصور کی جاسکتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد آزادی حاصل کرنے والے ممالک میں ہندوستان کو ایک ممتاز اور منفرد حیثیت حاصل رہی ہے۔ پوری تیسری دنیا میں ہندوستان وہ واحد ملک تھا جہاں جمہوری ادارے اور جمہوری عمل کو استحکام حاصل ہوا تھا اور آزادی، آزادیٔ موہوم نہیں بنی تھی اور معاشرہ انتشار اور نراجیت کا شکار نہیں ہوا جو عام طور پر تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کا مقدر ٹھہرا تھا۔ جمہوری اداروں کا استحکام اور جمہوریت کے راستے پر ہندوستان کا سفر نوآزاد ممالک کے لیے ایک قابلِ تقلید تجربے اور مثال کی حیثیت اختیار کرچکا تھا، چنانچہ ہندوستان اس حوالے سے سب سے بڑا جمہوری ملک گردانا جاتا تھا۔ ہندوستان کی جمہوریت کی روح اور اساس سیکولرزم رہا اور ہندوستانی آئین کے خالقوں نے جو ریاستی ڈھانچا استوار کیا تھا، اس کی بنیادیں سیکولرزم پر رکھی گئیں تھیں۔ حالیہ المیے نے جہاں ہندوستانی معاشرے کے چہرے کو داغ دار کیا، وہاں اس کے جمہوری آدرش، یعنی سیکولرزم کی نفی کرکے پورے جمہوری عمل اور سفر کو لایعنیت اور بے سمتی کا شکار کردیا ہے۔ سیکولرزم کے ہمارے یہاں بڑے گمراہ کن معنی اور مفہوم بیان کیے جاتے ہیں اور اس سے لادینیت اور لامذہبیت مراد لی جاتی ہے جو سراسر غلط اور شرانگیز ہے۔ اپنے سیاسی مفہوم میں سیکولرزم سے مراد ریاست اور حکومت کی مذہبی امور میں غیر جانب داری ہے۔ دیگر مفاہیم و مطالب کے ضمن میں سیکولرزم کو راسخ عقیدگی کے مدِمقابل خردافروزی و رواداری و روشن خیالی کا نظریہ و فلسفہ کہنا چاہیے جس کی اساس سائنسی فکر ہے۔ اخوت، آزادی اور مساوات جمہوریت کے عناصرِ ثلاثہ ہیں۔ آزادی و

مساوات کے تصورات سیکولرزم کے بغیر ممکن العمل ہو ہی نہیں سکتے۔ صرف سیکولر معاشرے اور ریاست میں تمام شہریوں کو مساوی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی غیر سیکولر معاشرے میں شہریوں کے درمیان امتیاز و تفریق ناگزیر ہے، چنانچہ پاکستانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے سلسلے میں بانیٔ پاکستان کے واضح ارشادات تھیوکریسی کے خلاف تھے اور پاکستان کو مذہبی ریاست بنانے کا کوئی تصور قائدِ اعظم کے پاس نہ تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ فکرِ قائدِ اعظم کے منافی ہے نتیجتاً ہمارا معاشرہ جمہوریت کے فیوض و برکات سے محروم رہ کر شکست و ریخت سے بھی دوچار ہوا اور غیر یقینیت کے مراحل سے گزر کر تشدد و عدم رواداری کی تاریکیوں میں گرتا چلا گیا۔ ہندوستان میں ہر چند کہ جمہوری ادارے مستحکم ہوئے اور جمہوری عمل کو پائداری نصیب ہوئی، مگر سیکولرزم کے آدرش سے اس کی بڑھتی ہوئی بے گانگی نے ہندوستانی جمہوریت کو جسدِ بے روح بنا دیا اور جمہوری ہندوستان رفتہ رفتہ بنیاد پرستی و مذہبی احیا پرستی کے سائے تلے ترقیٔ معکوس کا شکار ہوتا ہوا نظر آیا جس کا نقطۂ عروج ۶ دسمبر کا سانحہ ہے۔ اس المیے نے ہندوستانی معاشرے کو سنگین بحران سے دوچار کر دیا اور بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہاں کے اہلِ دانش اس معاشرے کی شکست و ریخت کے خدشات کا اظہار کرنے لگے ہیں۔

ہمارے اہلِ دانش کے لیے بھی یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ وہ سیکولر فکر کو ہدفِ ملامت بنا کر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کو دشوار تر بنانے کی روش اپناتے ہیں یا اسکے برعکس؟

نومبر دسمبر، ۱۹۹۳ء

# فسطائیت اور جمہوریت

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
(فیض)

سوویت یونین کے انہدام کے حوالے سے ساری دنیا میں طرح طرح کے مباحث چھڑے ہوئے ہیں۔ نظریاتی شکست و ریخت کی گفتگو بھی ہو رہی ہے۔ انقلابِ اکتوبر کی ناکامی کچھ حلقوں کی رائے میں جوزف اسٹالین کے سخت گیر آمرانہ طرزِ عمل کے باعث ہوئی اور کچھ حلقوں کے نزدیک اس کے برعکس اسٹالین کی حکمتِ عملی سے روگردانی کے سبب۔ کچھ لوگ سوشلزم کے ایک ماڈل کی ناکامی قرار دیتے ہوئے انتظامی کوتاہیوں کو موردِ الزام گردانتے ہیں، کچھ لوگ انقلابِ اکتوبر کی قیادت و سیادت کے منظرنامے سے کامریڈ لینن کے (بے وقت کی موت کے نتیجے میں) غائب ہو جانے کو آنے والے بحرانوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ خود انقلابِ اکتوبر کے ۱۹۱۷ء میں برپا ہونے کو قبل از وقت سمجھتے ہیں اور لینن کی رومانوی انقلاب پسندی کو سماجی ارتقا کے قانون کی عمل داری کے منافی جانتے ہیں۔

تازہ ترین نقطۂ نظر کے مطابق بنیادی خرابیاں خود مارکسی فلسفہ و نظریہ میں پائی جاتی ہیں اور مارکس کو خود ایک رومان پسند انقلابی گردانا جارہا ہے۔ اس کے برخلاف آج بیشتر حلقے اور مکاتب فکر مارکسزم کی صداقت کو برحق جانتے ہیں اور اس کی معنویت (relevance) کے زبردست حامی اور قائل ہیں، کیونکہ انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال جب تک ہوتا رہے گا، معاشرے میں عدم مساوات موجود رہے گا اور کارل مارکس کا معاشرے کو تبدیل کرکے انسان کو استحصال سے نجات دلانے اور معاشرے کو منصفانہ خطوط پر ازسرنو تعمیر کرنے کا نظریہ اٹل سچائی رہے گا۔ مارکس کے نظریات میں معاشرے کو تبدیل کرنے کے جو محرکات (dynamic) بتائے گئے ہیں، ان کا ردِ عمل اب تک سامنے نہیں آیا ہے۔

بہرحال سوویت یونین کے انہدام کا المیہ تاریخ پر اسی قسم کے اثرات مرتب کرے گا جس طرح کے دوررس اثرات خود انقلابِ اکتوبر کے نتیجے میں سوویت یونین کے قیام نے تاریخ کے سفر پر مرتب کیے تھے۔

سوویت یونین کے انہدام کے المیے پر گفتگو جاری ہے اور عرصۂ دراز تک جاری رہے گی۔ ماضی قریب میں ایک نیا المیہ بھی جنوبی ایشیا میں وقوع پذیر ہوا ہے یا اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ یہ المیہ دنیا کے سب سے بڑے جمہوریہ ہندوستان میں سیکولرزم کی سنگین صورتِ حال کا المیہ ہے۔ ہندوستان میں بنیاد پرستی اور مذہبی احیاپرستی جس فسطائیت کو جنم دے کر پروان چڑھا رہی ہے، اس سے ہندوستانی معاشرہ ہی متاثر نہیں ہوگا بلکہ اس کے اثرات ساری دنیا پر پڑیں گے اور خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک پر۔ جنوبی ایشیا کے ممالک تو براہِ راست زد پر ہوں گے ہی، اہل فکر و دانش کے لیے یہ انتہائی سنگین مسئلہ اور تاریخ کا ویسا ہی مرحلہ ہے جب اسپین میں دوسری جنگ عظیم سے کچھ ہی پہلے جنرل فرانکو کی قیادت میں فسطائیت کے عفریت نے سر ابھارا تھا۔ اس دور کے جمہوریت پسندوں نے اسے مجموعی طور پر

انسانی تہذیب و تمدن اور ثقافتی ورثے پر یلغار قرار دے کر جمہوریت اور ثقافت کی مدافعت کرنے کے لیے بین الاقوامی پیمانے پر ایک بریگیڈ تشکیل دیا تھا جس میں اہلِ دانش اور اہلِ قلم بھی شریک ہوئے تھے اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے تھے۔ ہندوستانی معاشرے کو جس فسطائیت کا سامنا ہے، اس کے ہول ناک نتائج اور اثرات کا عالمی برادری اور عالمی رائے عامہ کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے اور ہندوستان کی سیکولر جمہوری روایات کی پاس داری اور حمایت کے لیے موثر، ہمہ گیر اور جامع حکمتِ عملی تشکیل دی جانی چاہیے۔

اس ضمن میں صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ان تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے جو ہندوستان کے رسائل و جرائد میں بائیں بازو کے دانش وروں اور اہلِ قلم کی شائع ہورہی ہیں۔ ان روشن خیال اہلِ فکر و دانش کا تعلق مختلف فرقوں سے ہے۔ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری جنرل اور مشہور ترقی پسند ناقد و دانش ور ڈاکٹر قمر رئیس کی زیرِادارت شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے "نیا سفر" کے مندرجات سے ہندوستان میں فسطائیت کے حقیقی خطرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> "آخر دسمبر، ۱۹۹۲ء میں جب اس کا اداریہ قلم بند کرنے کا وقت آیا تو محسوس ہوا جیسے ذہن سے ادب اور اس کے مسائل کی آگہی کے سارے خیمے اکھڑ چکے ہیں۔ ادب کی وہ اقدارِعالیہ جن سے میرے وجود کی تہذیب ہوئی، اپنی معنویت کا سفینہ لے کر کسی انجان سفر پر چپکے سے نکل چکی ہیں اور میں نیم وحشی ہوگیا ہوں۔ ۶ دسمبر سے اب تک اس ملک میں غارت گری، بربریت اور بے دریغ ہلاکت کی جو گرم ہوائیں چلیں، انھوں نے ذہن کو صرف ایک نقطے ایک سوال پر مرکوز کردیا ہے۔ کیا یہ عظیم ملک مذہبی جنون اور

فرقہ وارانہ منافرت کی آگ میں جل کر بھسم ہوجائے گا یا زندہ
رہے گا؟ ۶ دسمبر کو ملک کی شفاف پیشانی پر جو داغ لگا ہے، اسے بحر
ہند کا سارا پانی بھی شاید دھو نہیں سکے گا۔ اس سانحے کے بعد ایک
نئے ہندوستان نے جنم لیا ہے جس کے خط و خال روشن ہوتے
جا رہے ہیں۔ یہ صرف ایک مسجد کا انہدام نہیں ہے، اس وحشیانہ
عمل نے مشترکہ تہذیب، متحدہ قومیت اور سیکولر جمہوری نظام کے
اس قلعے کی بنیادیں ہلادیں، اس میں دراڑیں ڈال دیں جس کے
سائے میں ہم امن اور سلامتی سے بیٹھے اکیسویں صدی میں ایک
جدید ہندوستان کی تعمیر کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ سارے خواب
اب ظلمت پرستی کی دھند میں تحلیل ہوتے نظر آتے ہیں"۔

ڈاکٹر قمر رئیس کی اس تحریر کا حرف حرف صورتِ حال کی سنگینی کی شہادت
دے رہا ہے۔

گزشتہ سال کے اوائل میں ہندوستان کے ایک اور معتبر ترقی پسند شاعر اور
دانش ور مرحوم غلام ربانی تاباں نے ہمیں دوران گفتگو ۶ دسمبر، ۱۹۹۲ء کے ہونے
والے المیے کی پیش گوئی کرتے ہوئے یہ کہا تھا:

"بابری مسجد آج کے حالات میں سیکولرزم کی علامت ہے۔
اس طرح اس کا انہدام گویا سیکولرزم کے انہدام پر منتج ہوگا۔ اس
کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ایسا نہیں کہ سیکولرزم پر یقین
رکھنے والے ہندوستان میں اقلیت میں ہیں، بلکہ بقول ان کے بھاری
اکثریت سیکولرزم پر یقین رکھنے والوں کی ہے۔ سیکولرزم دشمن
طاقتیں منظم ہونے کے باعث موثر ہیں اور سیکولرزم دوست
طاقتیں غیر منظم ہونے کے باعث غیر موثر ہیں۔ اگر سیکولرزم پر

یقین رکھنے والوں نے بنیاد پرستوں کی جارحیت کا موثر جواب نہیں
دیا تو جیسا کہ اب تک ہوا ہے، فسطائی طاقتیں پیش رفت کرتی چلی
جائیں گی اور معاشرہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جائے گا اور یہ تاریکیاں
ہندوستان کی فضاؤں سے نکل کر کرۂ ارض کے ایک بڑے خطے کو
اپنی لپیٹ میں لے لیں گی۔ اس کا احساس اہل دانش نہ کر پائے اور
بروقت اس کے سدِباب کے لیے آمادۂ جہاد نہ ہوئے تو جو المیہ ظہور
پذیر ہونے والا ہے، وہ اپنا دائرۂ عمل مکمل کر لے گا۔ صورتِ حال
کی سنگینی کے باوجود یہ رائے قائم کرلینا کہ ہندوستان میں سیکولرزم،
روشن خیالی اور خرد افروزی کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے، قنوطی
روّیے کا اظہار ہے اور ظلمت پرستی کے سامنے سر ڈال دینے کے
مترادف ہے"۔

جیسا کہ تاباں صاحب نے کہا تھا کہ ہندوستانی معاشرے کا ضمیر زندہ ہے اور
اکثریت جمہوری اقدار اور سیکولر تہذیبی روایات کے حق میں ہے اور ہر فرقے میں
ایسے لوگ ہیں جو اس محاذ پر سرگرم عمل رہے ہیں، ڈاکٹر قمر رئیس نے اس ضمن میں
بھی اپنے قارئین کو بتایا ہے کہ آج ہندوستانی معاشرے کے سامنے جو بڑا چیلنج ہے یعنی
مذہبی جنون کو ہوا دے کر سیکولر جمہوری نظام کی جگہ ہندو اور راشٹریا فسطائی نظام
قائم کرنے کا چیلنج، اس کا سامنا کرنے کی ذمے داری صرف مسلمانوں کی نہیں ہے۔
یہ ایسا چیلنج ہے جس نے پورے ملک کے ہر زبان، ہر مذہب، ہر علاقے کے
باضمیر، روشن خیال اور سیکولر ذہن کے دانش وروں، ادیبوں، فن کاروں، صحافیوں
اور نوجوانوں کو جھنجوڑ دیا ہے۔ ملک میں ایک نئی نظریاتی جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔
ایک طرف سماجی انصاف، مساوات، آزادیٔ فکر و اظہار اور انسان دوستی کی اعلیٰ
اقدار پر قائم جمہوری نظریۂ حیات ہے اور دوسری جانب ہند احیا پرستی اور موہوم ہندو

تہذیب پر قائم ایک totalitarian نظامِ حیات کی بالادستی کا تصور ہے جو فسطائی طاقتوں کی طرح تاریخ اور تہذیب کے سارے مظاہر کو مسخ کرکے پیش کر رہا ہے۔ اس نظام میں کسی دوسرے مذہب، نسل، تہذیب اور نظریۂ حیات کے پنپنے اور زندہ رہنے کی گنجائش ہی نہیں، اس لیے اس میں آزادیٔ فکر و اظہار کے حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظریاتی جنگ میں صرف مسلمانوں کو نہیں، جمہوری نظام کو عزیز رکھنے والی ساری طاقتوں، ساری جماعتوں کو شریک ہونا ہے کہ اس نظریاتی آویزش کا احساس عام ہو رہا ہے۔ سیکولر اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں سے قطعِ نظر، جنھوں نے بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے پروگرام اور حکمتِ عملیاں بنائی ہیں، ملک کی مختلف ادبی، تہذیبی، تعلیمی اور سیکولر مزاج کی مذہبی تنظیموں نے بھی فسطائی طاقتوں کے مقابلے میں سیکولر جمہوری نظام کی حمایت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان مذہبی تنظیموں میں بھارتیہ آریا پرتی ندھی سبھا (صدر سوامی اگنی دیش) اور اسلامی مرکز (صدر مولانا وحید الدین خان) شامل ہیں۔

ہندوستان میں بنیاد پرستی اور احیا پرستی کے پس منظر میں نظریاتی آویزش کے حوالے سے پاکستان کے دانش وروں اور اہلِ قلم کی ذمے داریاں اور فرائض یکساں ہیں۔ ہمارے ملک میں روشن خیالی اور خرد افروزی کے خلاف برسرِ پیکار طاقتیں دراصل بنیاد پرستی اور راسخ العقیدگی کی طاقتیں ہیں اور ان کی سرگرمیوں سے ہندوستان میں ہندو بنیاد پرستی کو براہِ راست تقویت پہنچتی رہی ہے۔ ہمارے یہاں کے رجعت پرست حلقے بڑے تواتر اور استقامت سے سیکولرزم کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ ہندوستان میں مسلم آبادی کا کیا بنے گا اور ان کی حیثیت کیا رہے گی؟ بنیاد پرستی اور راسخ العقیدگی کہیں بھی ہو اور کسی مذہب اور عقیدے کے حوالے سے ہو، اس کی نوعیت ایک جیسی ہوگی۔ آپ اگر ہندوستان میں ہندو بنیاد پرستی کی مذمت کرنے چلے ہیں تو آپ کو اپنے گریبان میں بھی جھانکنا

چاہیے۔ فارسی کا مقولہ ہے کہ "ہرچہ برائے خودرانہ پسندی برائے دیگراں مپسند"۔ آپ اپنے معاشرے میں عقیدت کی بنیاد پر عدمِ مساوات کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا رہ کر دوسرے معاشرے میں اپنے لیے مساوات کا خود کو حق دار جانتا کہاں کی منطق ٹھہرے گی؟

ہمارے یہاں ایک مکتبہ فکر بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ روشن خیالی اور خردافروزی کی بیخ کنی میں مصروف ہے اور اپنے معاشرے کو توہمات، اندھی تقلید اور راسخ العقیدگی کی تاریکیوں میں دھکیلنے کے در پے ہے۔ سیکولرزم کے سلسلے میں گمراہ کن پروپیگنڈا اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اگرچہ سیکولرزم نہ تو لادینیت و دہریت سے عبارت ہے اور نہ محض مذاہب کو فراخ دلی سے گوارا کرلینا اور ایک اعتدال پسندانہ رواداری برتنا ہے۔ سیکولرزم ایک سائنٹفک اصطلاح ہے جو انسانی سماجی ارتقا کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ انقلاب اور جمہوریت کے تصورات کے ساتھ پروان چڑھی ہے۔ سیاسی اعتبار سے سیکولرزم سے مراد مذہبی امور میں ریاست و حکومت کی عدمِ مداخلت اور غیر جانب داری ہے تاکہ مملکت میں رہنے والی تمام آبادی کو مساویانہ حیثیت اور مقام حاصل ہو اور کسی تفریق و تمیز کے بغیر سب برابر کے شہری ہوں اور مساویانہ حقوق اور منصب کے حق دار ہوں، لہٰذا ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو مساویانہ حیثیت اور حقوق حاصل ہوں تو ہمیں اپنے یہاں کی اقلیتوں کو وہی حیثیت اور مقام دینے کی تدبیر کرنی پڑے گی جس کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے طالب ہیں۔ ہم اپنے قلم قبیلے سے تعلق رکھنے والوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی ذمے داریاں محسوس کریں گے اور ہندوستان میں بنیاد پرستی اور مذہبی احیا پرستی کے خلاف نظریاتی جنگ میں اپنے کردار اور عمل سے غافل نہیں ہوں گے اور انھیں اپنے معاشرے میں بنیاد پرستی اور راسخ العقیدگی کے مقابلے میں

روشن خیالی اور خرد افروزی کے فروغ کے لیے اپنا زورِ قلم صرف کرنا ہوگا اور مصروفِ جد و جہد رہنا ہوگا۔

بدل دردے کزاں شیریں شمائل داشتم گفتم
گزشتم از سر خود ہرچہ در دل داشتم گفتم

فروری، ۱۹۹۳ء

# جمہوریت کا سفر

بدن پہ کیا ہے سلامت کہ آج ، بخیہ گروا
کسی سے عرض کریں پیرہن رفو چاہے

جمہوریت کا سفر پرپیچ ، صبر آزما اور دشوار گزار راہوں کا سفر ہے ۔ جمہوری عمل کا نہ تو کوئی نعم البدل اور نہ کوئی مختصر راستہ (short cut) ہے ۔ ہمارے ملک کی چار دہائیوں پر پھیلی تاریخ اس حوالے سے ان واقعات اور سانحات سے عبارت ہے جو کسی قوم کے لیے باعثِ افتخار نہیں کہی جا سکتی ۔ یہ تاریخ جمہوری آدرش اور روایات کی نفی کی تاریخ ہے اور جمہوریت پر یقین رکھنے والوں اور جمہوری نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے خلاف تعزیری کارروائیوں اور ان کی کردار کشی کی تاریخ ہے ۔ آغازِ سفر ہی سے المیوں سے دوچار ہونا عوام کا مقدر ٹھہرا ۔ جمہوریت پسند حلقوں اور طبقوں کا ایوان اقتدار پر تسلط قائم ہو جانے کے بعد سے ہر آنے والے دن کے ساتھ ان کی گرفت مضبوط تر ہوتی گئی ، دستور سازی میں غیر معمولی تاخیر سے جمہوری عمل کو سبوتاژ کرنے کی طرح ڈالی گئی ۔ ملک

کے پہلے وزیرِاعظم کو گولیوں کا نشانہ بنایا جانا جمہوریت کی منزل کھوٹی کرنے کی سمت پہلی کارروائی، پہلی دستور ساز اسمبلی کا غیر قانونی طور پر برخاست کیا جانا اور بعد ازاں دیگر چھ وزرائے اعظم کی نہایت قلیل عرصے میں اقتدار سے جبری سبک دوشی .... یہ تمام تر کارروائیاں اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ ان ریشہ دوانیوں کا نقطۂ عروج ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ کی صورت میں سامنے آیا۔ جمہوریت دشمن طاقتوں نے حب الوطنی کی سند بھی ہمیشہ اپنی تحویل میں رکھی اور عوام دوستی کو حب الوطنی کی ضد قرار دے کر اختلافِ رائے کا اظہار کرنے والوں کو معتوب گرداننے کی ایسی ریت اپنائی جو عہد بعہد جاری و ساری رہی۔ اس خنجر کے وار سے حسین شہید سہروردی اور میاں افتخار الدین جیسے اکابرینِ سیاست بھی محفوظ نہیں رہے۔ جمہوری اقدار کی نفی کرتے وقت یہ حلقے یہ حقیقت فراموش کر بیٹھے کہ فوجی آمریت قومی یک جہتی کو پارہ پارہ کر دے گی اور جمہوری عمل کا فقدان بے گانگی کے احساسات کو جنم دے گا جو ریاست کے بحران کا شکار ہونے پر منتج ہو گا۔ ۱۹۷۱ء کا المیہ دراصل لگ بھگ ربع صدی کی جمہوریت دشمن حکمتِ عملی کا منطقی نتیجہ بن کر تاریخ کا حصہ بن گیا۔ اس المیے سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد کا سفر بھی انھی راہوں کا سفر رہا اور جمہوری روایات کو پروان چڑھانے کے بجائے جمہوریت دشمنی کی روش جاری رکھی گئی۔ یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ جمہوری اداروں اور سیاسی قیادت کو رائے عامہ کی نظر میں اعتبار اور توقیر حاصل کرنے کی تاریخ کے کسی موڑ پر کوئی سعی مشکور کامیاب نہیں ہونے دی گئی بلکہ رسوائی کا سامان بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ فراموش نہیں کیا گیا۔ چنانچہ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ شہیدِ ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں سے لے کر محترمہ بے نظیر بھٹو تک کسی وزیرِاعظم کو اپنی آئینی مدت پوری کرنے نہیں دی گئی اور سبھوں کو ذلیل و رسوا کرنے کی مہم کا سامنا کرنا پڑا اور بڑی بے توقیری سے ایوانِ اقتدار سے رخصت کیا گیا۔

جمہوری اداروں کو استحکام اور اعتبار سے محروم رکھنے کے باب میں جہاں جمہوریت دشمن قوتوں کا فیصلہ کن کردار رہا ہے، وہاں موقع پرستی کے دین پر ایمان رکھنے والی سیاسی قیادت اور اہل فکر و دانش کے کارہائے نمایاں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ مشاہدہ عام رہا ہے کہ ہر دور میں آمرانہ اقدام کے حق میں استدلال پیش کرنے والوں اور رطب اللسانی کرنے والوں میں سیاسی اکابرین بھی نظر آئے ہیں اور اہل علم و دانش بھی پیش پیش رہے ہیں، اور یہ روش آج تک قائم ہے تینتالیس برسوں پر پھیلی ہماری قومی تاریخ کے بیشتر عرصے میں آمریت کا دور دورہ رہا ہے۔ وقفے وقفے سے جو جمہوری ادوار معاشرے کو میسر آئے، وہ سوچے سمجھے منصوبوں کے تحت دورِ ابتلا میں تبدیل کر دیے گئے۔ عوام کے لیے گزشتہ تمام ادوار کم تر شر کو قبول کرنے اور رد کرنے کی آزمائشوں کے مرحلے میں فوجی آمریت سے جب بھی نجات حاصل ہوئی، جاگیری جمہوریت کے شکنجوں نے عوام کو جکڑ لیا، گویا استحصالی طبقات شکلیں بدل بدل کر عوام کی قوتِ برداشت کو آزمانے میں مصروفِ عمل رہے ہیں۔ ان تمام کرب ناکیوں کے باوجود جمہوری آدرش اور جمہوری اقدار کی افادیت پر عوام کا ایقان اور اعتماد قائم و دائم رہا، یہ بڑی خوش آئند بات ہے

۱۶ نومبر، ۱۹۸۸ء کو جمہوری عمل کی بحالی کا جو سورج طلوع ہوا تھا، وہ بہت جلد گہنانے لگا اور اس کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آنے والی جمہوری حکومت بیس مہینوں کی قلیل مدت میں برخاست کر دی گئی اور اس کے ساتھ تمام اسمبلیاں بھی کالعدم ہو گئیں۔ بیس مہینوں کے عرصے میں سابقہ جمہوری حکومت کو تنقید اور نکتہ چینی کا ہدف بنایا گیا۔ وہ عین جمہوری روایات کے مطابق تھا، مگر کچھ حلقوں نے اپنی تنقید اور نکتہ چینی کو جو معیار عطا کیا، وہ یقیناً قابل رشک کہلانے کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ گزشتہ حکومت کی مخالفت میں کچھ نے خود جمہوریت کو ہدفِ ملامت بنانے میں پیش ہو گئے اور انھوں نے جمہوری اقدار کی پاس داری کو بالائے طاق رکھ کر ماضی قریب

کے دورِ آمریت کے گن گانے اور قصائد تحریر کرنے میں کوئی عذر اور جھجک محسوس
نہیں کی، ہرچند گزشتہ دورِ آمریت نے معاشرے کو جو کچھ نمایاں طور پر عطا کیا تھا،
وہ ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر تھا جس کلچر کے فیوض و برکات سے معاشرہ جس بھیانک
صورتِ حال سے دوچار رہا ہے، وہ سب پر عیاں ہے۔ اپنے دورِ اقتدار کو طول دینے
اور اسے دوام بخشنے کے لیے آمریت کے مورثِ اعلیٰ نے جو عوام کو عمودی طور پر
تقسیم کرنے اور ایک نسلی اور لسانی گروہ کو دوسرے گروہ کے مدِ مقابل کھڑا کرنے
کا عظیم کارنامہ انجام دیا جس کے نتیجے میں بھائی نے بھائی کا جس طرح بے دریغ
کشت و خون کیا، ہزاروں معصوم اور بے قصور شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا
اور خوف و دہشت کی جو گرم بازاری قائم کی گئی، وہ بھی کوئی رازِ سربستہ نہیں ہے۔
اس "عظیم ورثہ" کی تعریف و توصیف میں مصروف اکابرین سیاست اور صاحبانِ قلم
کو "خراج تحسین" پیش کرنے کے علاوہ ان کی خدمت میں اور کیا عرض کیا جا سکتا
ہے؟ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو (divide and rule) کی حکمتِ عملی بیرونی
آقاؤں کو تو شاید زیب دیتی ہو، مگر "جذبۂ اسلامی" سے سرشار اور "اخوتِ اسلامی" کے
علم بردار آمر مطلق کے لیے امتِ مسلمہ کو اس طرح خانوں میں بانٹ کر ایک
دوسرے کے خون کا پیاسا بنانے کا استحقاق کس طرح بنتا تھا؟ اور اس ورثے کے زعما
اس کا کیا جواز پیش کر سکتے ہیں؟

۲۴ اور ۲۷ اکتوبر کے عام انتخابات کے انعقاد کو جمہوری عمل کی پیش رفت
قرار دیے جانے کے علاوہ اور کوئی متبادل مثبت نقطۂ نظر یا رویہ پیش نہیں کیا جا سکتا
گزشتہ عام انتخابات کے نتائج کی صحت اور عدم صحت کے حوالے سے متضاد آرا سامنے
آئی ہیں، مگر یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کی طرح نتائج کو تسلیم نہ
کرنے کی روایت نہیں اپنائی گئی اور پرامن انتقال اقتدار کے راستے مسدود نہیں کیے
گئے۔ چنانچہ نئی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں نے اپنے اپنے منصب سنبھال لیے ہیں

اور حکومتیں تشکیل پذیر ہو چکی ہیں، اس طرح جمہوری عمل کی ساکھ قائم ہوئی ہے، عوام کا ووٹ پر اعتماد مزید بڑھا ہے، اور عوام نے یہ دیکھا کہ اقتدار کی پرامن تبدیلی صرف جمہوری عمل کے ذریعے ممکن ہے، آمریت میں اس قسم کی تبدیلیِ اقتدار کا کوئی تصویر نہیں پایا جاتا ۔ بہرحال اب حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف، دونوں کا یہ فرضِ منصبی بنتا ہے کہ پچھلی غیر جمہوری روش ترک کر کے جمہوری عمل کی پاس داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمہوری اداروں کے استحکام کے لیے اپنے گروہی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر بہتر افہام و تفہیم کو بروئے کار لائیں ۔

سابقہ جمہوری حکومت کی قلیل مدت کے دوران حزبِ اختلاف کا کردار کسی طور تعمیری نہیں تھا بلکہ منفی کہا جانا چاہیے، کیونکہ اس کے پیشِ نظر حکومت کو ناکام کرنے کے ہدف کے علاوہ کوئی اور نصب العین نہیں تھا، مگر اس سنت کو موجودہ حزبِ اختلاف کو اپنانے کے بجائے جمہوری اثباتیت کی روایت قائم کرنے کی داغ بیل ڈالنی چاہیے ۔ حزبِ اقتدار کے لیے سابقہ حکومت کی ناکامی میں اس ناعاقبت اندیشانہ محاذ آرائی کی حکمتِ عملی اور اپنے حلیفوں کو نظرانداز کرنے کی پالیسی کا جو کردار رہا، وہ درسِ عبرت ہونا چاہیے ۔ سابقہ حکومت کے محدودات کا جس طرح استحصال ہوا تھا جس کے نتیجے میں اسے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ہمہ وقت مصروفِ عمل رہنا پڑا، ایسی صورت میں اس کی ٹھوس کارگزاریوں کا میزانیہ ہمارے سامنے ہے ۔ یہ صورتِ حال موجودہ حکومت کو یقیناً درپیش نہیں ہونا چاہیے حزبِ اختلاف کو حکومت کی راہ میں ایسی رکاوٹیں کھڑی نہیں کرنا چاہییں جن سے عوامی مفادات کے حصول کی منزل کھوٹی ہو جائے ۔ خصوصیت کے ساتھ صنعت کاری کے باب میں موجودہ حکومت نے جن عزائم کا اظہار کیا ہے، اس سلسلے میں کسی منفی رویے کا اظہار نہیں کیا جانا چاہیے:

ایک جہاں سے روٹھ کے ایک جہاں میں کھو گئے
ہم کہ یقیں گزیدہ تھے، دشتِ گماں میں کھو گئے

دسمبر، ۱۹۹۰ء

# جمہوری مسلک کے تقاضے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

۱۶ نومبر، ۱۹۸۸ء کو گیارہ سال کے دورِ آمریت کے بعد جمہوری عمل کی بحالی عام انتخابات کے انعقاد کی صورت میں ہوئی تھی۔ ۲ دسمبر، ۱۹۸۸ء کو منتخب حکومت کے قیام سے جمہوری اداروں کو نئی معنویت حاصل ہو گئی۔ معاشرے کے دیگر جمہوریت پسند طبقوں اور حلقوں کے ساتھ ادیبوں نے بھی دورِ جمہوریت کا پرجوش استقبال کیا اور جمہوری اقدار کے ساتھ اپنی دیرینہ وابستگی کے حوالے سے اس کی پذیرائی کی۔ مارچ، ۱۹۸۹ء کی آخری تاریخوں میں لاہور میں جمہوریت پسند ادیبوں کا سہ روزہ کنونشن منعقد کیا گیا اور جمہوری نظام کو استحکام بخشنے کے لیے ادیبوں نے اپنے کمٹمنٹ کا اعادہ کیا اور جمہوری حکومت کو اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے جمہوری عمل کو درپیش خطرات سے آگاہ کیا۔ جمہوریت کی منزل کی سمت ازسرِنو آغازِ سفر کے روزِ اول سے غیر یقینیت کے بادل جو فضاؤں میں منڈلا رہے تھے، وہ ہر نئے دن کے ساتھ گہرے ہوتے گئے اور روشنی معدوم ہوتی چلی گئی۔ برسرِاقتدار افراد

نے بھی اپنی ترجیحات میں جمہوری آدرش کو سرخ رو دیکھنے کے بجائے اپنے محدود مفادات کو آگے رکھا، حرص و ہوس کا بازار گرم ہو گیا۔ دوسری طرف حزبِ اختلاف نے نوزائیدہ جمہوری حکومت کو ہر قیمت پر ناکام کرنے کی روش اپنائی۔ اختلافِ رائے کے حق کو تعمیری تنقید کے ذریعے صحت مند جمہوری روایات قائم کرنے کے بجائے تنقیص اور تضحیک کا استحقاق سمجھا گیا۔ ذرائع ابلاغ کو اس عرصے میں جو آزادی حاصل ہوئی، وہ آزادی جمہوریت کو فروغ دینے کے لیے کم اور اس کی بیخ کنی کے لیے زیادہ استعمال ہوئی۔ کچھ اہلِ دانش نے اپنی تمام تر توانیاں دورِ آمریت کے فضائل و برکات بیان کرنے میں صرف کیں اور بنیادپرستی اور رجعت پرستی کے ورثے کو اپنا آدرش گردانا اور روشن خیالی کی نفی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سیاسی قیادت نے اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کیں، اپنے محدود مفادات اور تنگ نظریوں کے گرداب میں پھنسے رہنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ غرض یہ کہ بیس مہینے کے جمہوری عمل کا سفر بے سمتی کا شکار ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے اور غیر یقینیت کا عفریت ایک بار پھر اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ ادیب برادری میں احساسِ زیاں کی جو فراوانی پائی جانا چاہیے، وہ آج پوری شدت سے پائی جاتی ہے۔ "ہنوز روزِ اول" کے احساس نے مایوسیوں کی شکل اختیار کر لی ہے:

بگولے اوڑھنا ، موج سراب سر کرنا
یہی ہے شوق تو کس کو نصیب گھر کرنا

جمہوری عمل کی ساکھ کو مجروح کرنے کے لیے فسطائی رجحانات کو سیاسی زندگی میں جو عمل دخل اس عرصے میں حاصل ہوا اور معاشرہ کشت و خون کے جن بھیانک مراحل سے دوچار رہا، وہ دراصل سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو ہے۔ جرائم میں روز بروز اضافہ اور جرائم کا inspitual i sation ہونا ایک ایسا سوال ہے جس سے کسی کے لیے بے اعتنائی برتنا ممکن نہیں ہے۔ سیاسی عمل میں دہشت

گردی ایک عنصر بن کر ابھری ہے اور حقوق کے حصول کے لیے قانون کی بالادستی کے نظریے کو یکسر مسترد کر دینے کی بات چل نکلی ہے۔ رواداری کا فقدان کسی روشن خیالی کو پنپنے نہیں دے سکتا۔ جمہوریت کا شجر آج بے برگ و بار ہے اور اس میں نئی کونپلیں پھوٹنے کی امید امید موہوم بنتی جاری ہے۔ معاشرہ تناؤ اور کھنچاؤ کے کرب میں مبتلا ہے۔ معاشرے کو عمودی طور پر تقسیم کر کے مسائل کو سمجھنے اور اس کے حل کرنے کی کج روی کو قبول عام حاصل ہو رہا ہے۔ ایسے ماحول میں قلم کاروں کی ذمے داریاں کیا ہوتی ہیں، اس پر سوچ بچار ہونا چاہیے، ہر چند کہ اب بات بہت آگے نکل گئی ہے، ادیب اور دانش ور اپنے کردار کے محدودات کے پیش نظر خود کو بے بس محسوس کر رہے ہیں۔ بہر حال بے بسی ہمارا مسلک نہیں بن سکتی۔ اس سے پہلے بھی وقت نے ہماری راہ میں بلند و بالا فصیلیں کھڑی کی ہیں، عہد بعہد، راہ در راہ ایسے اشارے نظر آئے ہیں جو صرف اور صرف گم راہی کی سمت بتاتے رہے ہیں، لیکن انھوں نے روزِ اول سے جو رخ اختیار ہے، آج بھی اسی پر قائم ہیں۔ ہمارا سفر جاری ہے جس کو حالات پر پیچ اور دشوار تو بنا سکتے ہیں، مگر دنیا میں ایسی کسی شکل کا وجود نہیں ہے جو ہماری راہ کا پتھر ثابت ہو اور ہمارے اٹھتے ہوئے قدم کسی وقت، کسی دور اور کسی حال میں بھی تھم سکیں۔ ہم ادیب انسان دوستی کا پیغام دیتے رہتے ہیں اور یہ منصب ہمیں ہمیشہ عزیز رہے گا۔ انسانی معاشرے میں پائے جانے والے مصائب و آلام کو ہم خانوں میں بانٹ کر کبھی دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ انسانی خون کا بس ایک ہی رنگ ہے اور ہماری آنکھیں بس اسی حوالے سے پرنم ہوا کریں گی۔ ادب آفاقی قدروں کا علم بردار رہا ہے اور جمہوری آدرش اس کا جزو لاینفک ہے۔ جمہوری اقدار کی سرخ روئی کے لیے ادیبوں کا منصب جو پہلے تھا، سو آج بھی ہے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ستمبر ۱۹۹۰ء

# اظہار و ابلاغ

# اظہار، ابلاغ اور قاری

ادب صرف اس وقت زوال آمادہ نہیں ہوتا جب
تخلیق کاروں کی آمد رک جاتی ہے ۔ یہ اس وقت بھی زوال پذیر ہوتا
ہے جب قاری نکتہ آفرینی اور آزادہ روی سے خوف زدہ ہو کر روایت
کے کھنڈرات میں پناہ ڈھونڈتا ہے " ۔

یہ اختتامی جملے موقر جریدے اوراق کے تازہ شمارے (اگست ، ستمبر ۱۹۹۵ء)
کے اداریے کے ہیں جو ڈاکٹر وزیر آغا کا تحریر کردہ ہے جو " پہلا ورق " کے زیر عنوان
ایک عرصے سے لکھا جا رہا ہے جو " اوراق " کی پہچان بھی ہے اور خصوصیت بھی ۔ ان
کالموں میں ادب کے اہم ترین مسائل و موضوعات زیر بحث لائے جاتے رہے ہیں جن
کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی رہی ہے ۔ زیر نظر اداریے کے موضوع پر
اظہار خیال کرنے کی تحریک ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے ایک فقرے سے inspire ہو
کر ہوئی ۔ بقول ان کے ، " ڈاکٹر وزیر آغا ایک ایسے دانش ور اور تخلیق کار ہیں جن سے
مکالمہ کیا جا سکتا ہے " ۔ یہ فقرہ ڈاکٹر وزیر آغا کے علم و فضل اور بصیرت و بصارت کی
دلالت کرتا ہے ۔

مذکورہ اداریہ اور آج کے مخصوص تناظر میں ادب کی زوال آمادگی بذاتِ خود موضوعِ گفتگو نہیں بلکہ ایک سرسری حوالہ ہے ۔ موضوعِ گفتگو ادب کا قاری ہے نہ کہ ادب کی زوال آمادگی ۔ ایسا نہیں ہے کہ ماضی میں اٹھائے گئے سوالات پھر سے اٹھائے گئے ہوں اور ادب کو درپیش زوال یا انجماد پر ازسرِ نو روشنی ڈالی گئی ہے ۔ البتہ بین السطور میں ان خدشات اور اندیشہ ہائے دور دراز کی طرف نشان دہی ضرور ہوتی ہے جو مستقبلِ قریب یا بعید میں منطقی حقیقت کی صورت میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں ۔ ویسے یہ ادب کی زوال آمادگی پر گفتگو اس وقت کچھ زیادہ بے محل (irrelevant) بھی نہیں ہے ۔ ادبی کتابوں اور جریدوں کی تعدادِ اشاعت پر غور و فکر کیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ وقت کے ساتھ ادب معاشرتی زندگی کی ترجیحات سے خارج ہونے کے عمل سے دوچار ہے ۔ اس کے اسباب و علل پر گفتگو اور تفکر و تدبر ایک جداگانہ اور مکمل موضوع ہے ۔ ہمارے معاشرے میں ادبی کتب و جرائد کی بڑھتی ہوئی عدم پذیرائی خود ادب کی عدم پذیرائی پر دال ہے جس کی طرف سے بے توجہی کو کس حد تک ہم afford کر سکتے ہیں ، اس پر ضرور سوچنا چاہیے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن میں ادب کے قاری پر کچھ ذمے داری عائد کی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

> " اردو کے موجودہ منظرنامے میں سارے مطالبے تخلیق کار سے کیے گئے ہیں ، قاری سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کیا گیا ۔ چنانچہ جہاں کہیں تخلیق کار نے مستعمل شعری اسلوب کو عبور کیا ہے ، یعنی اسے نامانوس defamiliarize کیا ہے ، وہیں قاری کی بھویں تن گئی ہیں اور اس نے غرابت غرابت کی دہائی دینا شروع کر دی ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قاری کو شعر فہمی کے علاوہ ادب سے لطف اندوز ہونے کی تربیت بھی دی جائے ، نیز تخلیق کو

کھولنے کے لیے نئی چابیاں مہیا کی جائیں"۔

غرض یہ کہ اصل بات شعر فہمی کی ٹھہرے گی، کیونکہ شعر فہمی کے بغیر لطف اندوز ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جس کیفیت، احساس، فکر، جذبہ و کرب اور ان میں سے جو کچھ کسی تخلیق میں ہو، جب تک اس تک رسائی نہ ہو، اس سے متاثر ہونے کا موقع کہاں آتا ہے؟ لطف و کیف کا حصول شعر فہمی سے جڑا ہوا ہے۔ قاری کی شعر فہمی کی بات براہِ راست ابلاغ کا مسئلہ ہے۔ تخلیق کار کی یہ آرزو کہ اس کا قاری اس کے تخلیقی سفر کا ادراک حاصل کرے اور اس کا ہم سفر بن جائے، بڑی فطری اور منطقی ہے۔ تخلیق کسی تخلیق کار کے خونِ جگر اور سوزِ دروں کی شمولیت کے ساتھ اس کے فکر و نظر کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ تخلیق کسی طور پر بھی مجذوب کی بڑ نہیں ہوتی کہ جس کا جو جی چاہے معنی نکالے۔ تخلیق کار نے جو کچھ کہنا چاہا ہے، اس کی یہ تمنا ہو گی کہ وہ اس کے قاری تک ضرور پہنچے۔ یہاں مجھے آغا صاحب کی نظم "اک کتھا انوکھی" کے پیش لفظ کے اختتامی جملے یاد آرہے ہیں:

"تخلیقِ شعر کا عمل بھی مزاجاً ایک ایسا ہی سفر ہے جو دائرے یا خطِ مستقیم کے بجائے بعض پراسرار ابعاد کے اندر بھی ہوتا ہے، اسی لیے ہر شعری مہم ایک انوکھی شے ہے۔ اگر وہ انوکھی نہ ہو تو پھر وہ شعری مہم نہیں، کوئی اور شے ہے۔ ہر نظم بلکہ ہر شعر کی تخلیق ایک نئے دیار میں پاپیادہ سفر کرنے کا نام ہے، اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے عمر بھر اس سفر میں مبتلا رہنے کا موقع ملا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اس سفر کی ایک صدی، ایک سال یا ایک لمحے کی کہانی ہے۔ اگر قاری میرا ہم سفر بن کر اس انوکھی کتھا کو میرے ساتھ سننے پر مائل ہو جائے تو میں اسے اپنے لیے ایک بہت بڑی سعادت سمجھوں گا۔"

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات بڑی واضح ہو جاتی ہے کہ قاری کی شعر فہمی تخلیق کار کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے، چنانچہ قاری کی شعر فہمی کے باب میں آغا صاحب کا یہ جملہ بڑی بلاغت و معنویت کا حامل ہے:

"ضرورت اس بات کی ہے کہ قاری کو شعر فہمی کے علاوہ ادب سے لطف اندوز ہونے کی تربیت بھی دی جائے۔ نیز تخلیق کو کھولنے کے لیے نئی چابیاں مہیا کی جائیں"۔

تربیت اور چابیاں مہیا کرنے کی بات اور تجویز توجہ طلب بھی ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہے۔ قاری کی تربیت اور اسے نئی چابیاں مہیا کی جانے کی کیا صورت اور وسیلہ ہو، اس پر ڈاکٹر صاحب کو وضاحت کرنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی میرے نزدیک تو قاری کو خوش ذوقی اور ادب سے اس کا گہرا لگاؤ فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے اور ادب کا مطالعہ اسے جلا بخشتا ہے اور بقول علی سردار جعفری، "فن وہ جو دل کو چھولے"۔ دل کو چھولینے والے فن پارے کی تفہیم کے لیے غالباً کسی چابی کی ضرورت نہ پڑے، لہذا تربیت، قاری اور ادب پارے کو کھولنے والی چابی کے نکتے کی وضاحت ناگزیر ہے۔ بہر حال ڈاکٹر وزیر آغا ان ساختیاتی نقادوں سے اس ضمن میں مختلف موقف رکھتے ہیں جو بقول شہزاد منظر مرحوم:

"ساختیاتی نقادوں کا خیال ہے کہ تخلیق کے معرض وجود میں آنے کے بعد مصنف کی "موت" واقع ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ مصنف کی تخلیق سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ ادب پارے (متن) کو جو جی چاہے معنی پہنائے۔ ساختیاتی نقادوں کا خیال ہے کہ تخلیق میں پہلے سے کوئی معنی نہیں ہوتا۔ یہ قاری ہوتا ہے جو اس میں معنی پہناتا ہے، اس لیے تخلیق میں مصنف کے عندیے کو نہیں دیکھنا چاہیے اور نہ یہ کہ تخلیق کار اپنی

تخلیق کے دیگر معنی کا ادراک رکھتا ہو ۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ تخلیق کے کوئی متعینہ معنی نہیں ہوتے ۔ یہ قاری کی صواب دید پر مبنی ہے کہ وہ اپنے فہم، تجربے اور مطالعے کی بنیاد پر تخلیق کو کیا معنی پہناتا ہے ۔ اس طرح ساری بحث میں مصنف اور متن کے بجائے قاری کو مرکزیت حاصل ہو جاتی ہے"۔

یہ اقتباس "تربیت یافتہ قاری کا سوال" کے زیرِ عنوان جناب شہزاد منظر کے مضمون سے ماخوذ ہے جو "طلوعِ افکار" کے ستمبر ۱۹۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ ادب فہمی کی مذکورہ exercise میں مصنف کے ساتھ جو سلوک روا رکھے جانے کی بات کی گئی ہے ، اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود ادب کو denumerise کر کے دیکھنے کی بات بڑھائی جا رہی ہے جس کا نوٹس لیا جانا چاہیے اور ادب کی مبادیات پر از سرِ نو غور کیا جانا چاہیے ، اور اس صورتِ حال میں یہ سوچنا چاہیے کہ پھر انسان کو ادب کی ضرورت بھی کیا ہے ۔ ہمارے نزدیک تو ادب سماجی زندگی کا مظہر اور ترجمان ہوتا ہے اور تخلیقِ ادب ایک سماجی عمل اور سماجی ذے داری ہے ۔ حسن کاری فن کا منصبِ خاص ہے ۔ حسن کا سرچشمہ زندگی سے پھوٹتا ہے، اس طرح حسن کاری دراصل زندگی کی شاعرانہ مصوری کا دوسرا نام ہے ۔ معاشرے کی بدصورتیوں کا ادب میں موضوع بنایا جانا اس سلسلے کی کڑی ہے اور غرض معاشرتی زندگی کو ان بدصورتیوں سے نجات دلانا ہے ۔

ادب کی تفہیم میں نہ صرف یہ کہ مصنف کی حیثیت کلیدی ٹھہرتی ہے بلکہ اس کے مظہر حالاتِ زیست ، تاریخی پس منظر اور پیش منظر، سماجی اور سیاسی حالات کو بغیر پیشِ نظر رکھے ادب کی تفہیم ممکن نہیں ۔ کسی تخلیق اور تحریر کو مصنف ، زمان اور مکان سے کاٹ کر دیکھنا اور تفہیم کی سعی کرنا میرے نزدیک سعیِ رائگاں کے علاوہ کچھ نہیں ۔ اور خود ان نظریات اور افلاطون اور ارسطو کے نظریات اور افکار کو

نظر انداز کر کے ان کی تصنیفات کا مطالعہ کرنا اور ان کی تفہیم کا دعویٰ کرنا کس قدر مضحکہ خیز بات ہو گی! اس طرح میر و غالب و اقبال کو ان کی تحریروں سے جدا کر کے ان کی تحریروں کو سمجھنے کی بات کرنا کس قدر دلچسپ مذاق ہے! اور پھر لطف اندوز ہونے کی بات کرنا اس سے آگے کی بات ہے ۔ متن ، صاحبِ متن اور جس عہد سے اس متن کا تعلق ہے ، یہ تینوں باتیں پیش نظر رکھ کر تخلیق کی تفہیم کے ساتھ انصاف کرنا ممکن ہے ۔ ان تینوں کو جدا جدا کر کے دیکھنا خود الجھانے اور ادب کو چیستاں بنانے کے مترادف ہے ۔

جہاں تک قاری کی بات ہے تو اسے کسی تخلیق کے معنی متعین کرنے کا حق دینا مصنف اور تصنیف ، دونوں کی نفی کرنے کے برابر ہے اور اس صورتِ حال میں ادب کی [illegible] حیثیت ، اہمیت اور افادیت ، سبھی مشکوک ہو جائے گی ۔ ساختیاتی تنقید کی بوالعجبی کبھی متن کو اصل اہمیت بخشتی ہے تو یہ بتایا جاتا ہے کہ متن خود مکتفی ہے اس لیے متن ہی سب کچھ ہے ۔ لہذا متن کو سمجھنے کے لیے مصنف کا سمجھنا قطعی ضروری نہیں اور نہ یہ جاننا ضروری ہے کہ مصنف نے کن حالات اور کن اثرات کے تحت ادب تخلیق کیا ۔ اب اس سے دو قدم آگے کی بات ہے کہ تخلیق یا متن میں بہت سی باتیں رہ جاتی ہیں یا مصنف نے التوا میں ڈال دی ہیں ، لہذا یہ قاری کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ ایسی باتوں کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرے اور ان gaps کو پر کرے جو مصنف نے اپنی تخلیق میں خالی چھوڑ دیے ہیں ۔ گویا ادب فہمی کی تمام تر ذمے داری قاری کو سونپ دی گئی ہے ، اس طرح مصنف اور متن کی حیثیت کم کر کے قاری کی حیثیت نہ صرف غیر معمولی بنا دی گئی بلکہ قاری کو مرکزی حیثیت بخش دی گئی ۔ ایسا کرتے وقت یہ نکتہ فراموش کر دیا گیا کہ قاری کی علمیت ، فہم و ادراک اور ادب کو پرکھنے کی صلاحیتیں ، تنقیدی شعور ، بصیرت اور ذہنی سطح ایک جیسی نہیں ہو سکتی ، لہذا اگر قاری کو ادب کو پرکھنے اور اس کا معنی و مفہوم متعین

کرنے پر فائز بھی کر دیا جائے تو یہ پرکھ اور تفہیم ناقابل اعتبار بلکہ مشکوک ہو گی اور ادب نراجیت کا شکار ہو جائے گا۔ ادیب کے منصب پر سبھی متفق ہیں کہ اس کا شعور و ادراک اور حسیت دیگر افرادِ معاشرہ کے مقابلے میں فزوں تر ہوتی ہے۔ تخلیق ادب میں ادیب کے علم و فضل و شعور کے ساتھ اس کا نقطۂ نظر شامل نہیں ہوتا، وہ سوچ سمجھ شعر نہیں کہتا۔ شعر گوئی کا سرچشمہ بھی اس کے شعور سے پھوٹتا ہے اور احساس کی پہنائیوں کو چھوتا ہوا ایک ایسے سیل رواں کی شکل اختیار کرتا ہے جو اپنے ساتھ قاری کو بھی بہالے جانے کی قدرت رکھتا ہو۔ مصنف جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اگر شعر کا مفہوم اس سے جداگانہ متعین کیا گیا تو گویا وہ تخلیق ایک شاعر ناکام کی کوششِ ناکام کہلائے گی اور خود تخلیق کی حیثیت میرے نزدیک تخلیقِ خام کی ہو گی جسے ابلاغ سے ہم کنار کرنے کے لیے مصنف کو مزید خونِ جگر نذرِ شعر کرنا ہو گا اور اسے tragedy of poetry کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

زیر نظر اداریے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی تمام تر توجہ تفہیمِ شعر کے حوالے سے قاری پر مرکوز رکھی ہے۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک تخلیق میں ابلاغ کی اہمیت مسلم ہے اور وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ان کا قاری ان کا ہم سفر اور تفہیم شعر کے اس مرحلے پر ہو جہاں فن سے لطف اندوزی حاصل ہو سکے۔ ہم سفری سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ قاری کو مفہومِ شعر متعین کرنے کا منصب نہیں سونپتے بلکہ وہ قاری تک اس مفہوم کی ترسیل چاہتے ہیں جو بات انھوں نے اپنی اس تخلیق میں کہنے کی سعی کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر صاحب ساختیاتی تنقید کے اس نقطۂ نظر سے کس حد تک اتفاق رکھتے ہیں جس کا درج بالا سطور میں ذکر آیا ہے، مگر میں نے ان کی نگارشات (نثری اور شعری دونوں) پڑھ کر اتنا ضرور سمجھ پایا ہوں کہ ابلاغ سے محروم تخلیق ان کے نزدیک کسی سند کا استحقاق نہیں رکھتی۔ وہ تو بھرپور ابلاغ کی شاعری کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ

وہ اپنی شعری تخلیقات میں غیر معمولی تہ داری کا التزام کرتے ہیں اور قاری کو اس کی تہوں میں اترنے کی دعوت دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی طویل نظموں کی تقریظوں میں وہ چابی بھی قاری کو فراہم کر دی ہے جس کا مذکورہ اداریے میں ذکر آیا ہے اور جسے وہ قاری کی تربیت کے ساتھ ساتھ اسے شعر کی تہوں تک پہنچنے میں مدد دینے کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔

ادب کے قاری کی تربیت اور اسے رموزِ شعر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے چابی فراہم کرنے کی بات سے جہاں تفہیمِ شعر میں گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے، وہاں مشکل پسندی کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ قاری کو کسی تخلیق کی گہرائی تک پہنچنے اور لطف اندوز ہونے کی دعوت دینا اسے مشقت سے دوچار کرنا ہے۔ آج کے ادب کے قاری کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ اس عرق ریزی کی اذیت اٹھائے۔ ہاں! اگر قاری، سے مراد ناقد ہے تو اسے یقیناً یہ مشقت اٹھانی ہوگی اور اسے وہ تربیت حاصل کرنا ہوگی جس سے شعر کے باطن اور باطنی خصوصیات تک اس کی رسائی ممکن ہو۔ ایک عام قاری سے یہ توقع کرنا اور اسے ان مراحل سے گزارنا، یعنی تربیت کا مرحلہ اور چابی کے حصول کا مرحلہ، میرے خیال میں ادب کے قاری کے دائرے کو تنگ سے تنگ تر کرنے پر منتج ہوگا۔ ادب کی اپیل اور ادب سے دلچسپی کے فروغ کے لیے ایسے شعری محاسن اور جمالیات کی طرف توجہ مرکوز ہونی چاہیے جو شعر کی اثر پذیری اور قبولیتِ عام میں معاون ثابت ہوں۔ تخلیقِ شعر میں تخلیقیت کو اولیت کا درجہ حاصل ہونا چاہیے اور شعری جمالیات کا بھرپور التزام ہونا چاہیے، مگر نامانوس علامتوں، تلمیحات اور استعارات و تشبیہات سے حتی الامکان گریز کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ شعر چیستاں نہ بن جائے۔ روایت سے یکسر لاتعلقی ادب کے ارتقائی عمل میں رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ نئے تجربات کے بغیر ادب زندگی سے محروم ہو جائے مگر روایت سے روگردانی گویا اپنے ماضی سے روگردانی ہوگی۔

ذوق شعری کی بات ہو یا شعر فہمی کی، ہم اپنے ماضی اور ورثے سے محروم رہ کر بصیرت و بصارت سے بھی رفتہ رفتہ محروم ہوتے چلے جائیں گے۔ ادب اور قاری کا رشتہ توانا سے توانا تر ہونا چاہیے۔ ادبی تخلیق کی حیثیت aesop & fables کی کہانیوں کی سی ہونی چاہیے جس سے morals حذف کر دیے گئے ہوں اور grapes are sour کہنے یا سوچنے کا منصب قاری کو سونپ دیا گیا ہو۔ یہ بات معنویت سے عاری نہیں ہوگی کہ غالب کے مشکل حصۂ کلام کے مقابلے میں آسان حصۂ شاعری کی شعریت کہیں زیادہ متاثر کن ہے اور قاری کے لیے زیادہ کشش رکھتی ہے۔ اقبال کی مشکل ترین نظمیں بھی قاری کے لیے پہیلیاں نہیں ہیں اور انھیں سمجھنے کے لیے کسی فرہنگ اور چابی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

غرض یہ کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ادب کا دائرۂ اثر shrink کرنے کے بجائے پھیلے اور ادب کے قاری کی تعداد چند ناقدین اور خاصان ادب تک محدود نہ رہے بلکہ ادب معاشرے میں رجحان سازی اور مثبت اقدار کے فروغ کا اہم instrument بنا رہے۔

# اظہار اور احتجاج

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب نے اس شعر میں جس سماجی و سیاسی جبر کا احاطہ کیا ہے، اس کا تعلق انیسویں صدی کے وسط کے حالات سے تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برطانوی نوآبادیاتی نظام کے اربابِ حل و عقد نے حریت پسندوں پر جو ظلم ڈھائے، تاریخ کے صفحات ان پر شاہد ہیں۔ جبر و ستم کی اس گرم بازاری کا ہدف اس دور کے اہلِ قلم بھی بنے۔ غالب کا جبر و ستم کے مقابل عزمِ صمیم کا اظہار ایک ایسا ردِ عمل ہے جو حریت پسندوں کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہے گا۔ فیض احمد فیض کے اس مشہور شعر کو حرمتِ قلم کی پاس داری کرتے رہنے کے عزم کا اعادہ سمجھنا چاہیے:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے، رقم کرتے رہیں گے

گزشتہ دنوں وطنِ عزیز میں ایک واقعہ، جسے سانحہ کہنا زیادہ درست ہو گا،

ظہور پذیر ہوا۔ اسلام آباد کے ایک انگریزی روزنامے میں ایک نظم چھپی جس کے
حوالے سے اس روزنامے کے خلاف مقدمۂ بغاوت قائم کر دیا گیا۔ اس قسم کا ایک
مقدمہ تقریباً چار دہائی قبل کراچی کے ایک روزنامے کے خلاف قائم کیا گیا تھا
تازہ ترین مقدمۂ بغاوت کے خلاف ملک کے اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے
وابستہ حلقوں کا اتنا شدید ردِ عمل ہوا کہ چند دنوں کے بعد حکومت نے یہ مقدمہ غیر
مشروط طور پر واپس لے لیا۔ اس مقدمۂ بغاوت کے سلسلے میں صرف اخبارات و دیگر
ذرائع ابلاغ سے وابستہ حلقوں نے شدید ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ بیشتر سیاسی
جماعتوں اور رائے عامہ کی نمائندگی کرنے والے تمام حلقوں نے انفرادی و اجتماعی
طور پر یکساں ردِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ ملک کے نام ور صحافی جناب ضمیر نیازی نے اس
سلسلے میں رائے زنی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ مقدمۂ بغاوت دراصل اظہار کی آزادی
پر یقین رکھنے والوں کے لیے ایک چیلنج تھا۔ اس چیلنج کا موثر جواب آنے پر ایوان
اقتدار کے پاس پسپائی کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ ایک کڑی آزمائش تھی۔
ذرائع ابلاغ اور رائے عامہ نے بڑی پامردی سے اس کٹھن صورتِ حال کا مقابلہ کیا
اور سرخ روئی حاصل کی۔ جناب ضمیرؔ نیازی ہماری دنیائے صحافت کی بڑی معتبر
شخصیت ہیں۔ ان کی کتابیں Press in Chain اور Press Under ....
Siege جو بالترتیب ۱۹۸۶ء اور ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئیں ہیں .... وطن عزیز میں
اخبارات (PrintMedia) پر جو کچھ بیتی ہے اور ذرائع ابلاغ سے وابستہ قلم کاروں
اور کارکنوں پر جو کچھ گزری ہے، اس کی ایک ایسی داستان ہیں جس کا ہر ورق اپنے
مواد کی درستی و صحت کے اعتبار سے دستاویز کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ دونوں کتابیں
یکساں قدر و قیمت کی حامل ہیں اور اظہارِ رائے کے کاز سے محبت رکھنے والوں کے لیے
یہ کتابیں cartamagna کا درجہ رکھتی ہیں۔ مذکورہ مقدمۂ بغاوت کے ضمن
میں ضمیرؔ نیازی صاحب کی رائے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا چاہیے کہ جمہوری اقدار و

روایات کی پاس داری اور تحفظ پورے معاشرے کا مسئلہ ہے ۔ کوئی مخصوص حلقہ تنہا اس کا تحفظ نہیں کر سکتا ہے اور نہ اسے کسی مخصوص حلقے کی ذمے داری قرار دے کر معاشرے کے دوسرے طبقات اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں ۔ جمہوری ادارے معاشرے کی ناگزیر ضرورت ہیں اور اہل قلم معاشرے کے ضمیر کے ترجمان ہوتے ہیں ۔ ماضی قریب میں مقدمۂ بغاوت کے حوالے سے قلم قبیلے کا ردِ عمل کچھ زیادہ دیکھنے میں نہیں آیا ۔ فوری ردِ عمل کی توقع کرنا غالباً درست بھی نہ ہو گا، کیونکہ ادیبوں کا ردِ عمل کسی مظاہرے یا احتجاج کی صورت میں ہونا معمول کا ردِ عمل نہیں ہوتا ۔ ادیبوں کا اصل ردِ عمل تو ان کی تخلیقات میں ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے ۔ اظہار پر قدغن اور جبر و پابندی کے نتیجے میں اصنافِ ادب کے اسلوب و ہیئت سے لے کر تمام تر صنائع و بدائع اور علامتوں میں بڑی کلیدی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ، چنانچہ ہمارے ادب میں ساٹھ کی دہائی کے بعد دو دہائیوں سے زیادہ عرصے تک ریاستی جبر و استبداد اور آمریت کی چیرہ دستیوں سے ایک طرف کچھ قلم کار براہِ راست نبرد آزما اور قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار رہے اور دوسری طرف قید و بند کے خوف کی بنا پر علامتوں کا سہارا لیا گیا ۔ کچھ حلقوں نے اس جبر اور گھٹن کی فضا میں ایسی علامتوں کو رواج دیا جو ابہام کے زمرے میں آتی ہیں ، اس طرح بعض ادب پاروں کا ابلاغ سے محروم ہونا قاری کی ادب سے مغائرت کا سبب بھی بنا ۔

ہمارے ملک میں اظہارِ رائے کی آزادی پر ریاستی استبداد و قدغن نئی بات نہیں ہے ، اس دائرۂ جبر میں ادبی تحریریں بھی شامل ہیں اور ادبی تخلیقات کا غیر قانونی قرار دیا جانا آئے دن کا معمول رہا ہے ۔ اس فہرست میں کتابوں کے علاوہ ادبی جرائد و مجلات بھی آتے ہیں ۔ مولانا ابو الکلام آزاد ، مولانا حسرت موہانی ، مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر نے برطانوی نوآبادیاتی سلطنت کی طرف سے ہونے والی چیرہ دستیوں کے خلاف جدوجہد اور قربانیوں کی جو روشن مثالیں قائم کی ہیں ، وہ آج بھی

قابل فخر و قابل تقلید ہیں ۔ یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ ان اکابر نے آزمائش میں جو سرخ روئی حاصل کی تھی ، اس میں عوام کی پرجوش تائید و حمایت کا بھی بڑا عمل دخل تھا ۔

آزادی کے بعد قلم پر تحدید و قدغن میں کمی آنے کے بجائے اس کی سنگینی میں اضافہ ہوا ہے ۔ کتابوں کو ممنوع قرار دیے جانے کے علاوہ مصنفین کے خلاف مقدمات و تعزیری کارروائیاں اور اہل قلم کو مشکوک گرداننے کی روش جاری و ساری ہے ، اور اکثر اہل قلم زنداں کی سلاخوں کی قربتوں سے بھی نوازے جاتے رہے ہیں ۔ اربابِ اقتدار اگر اپنی روش پر قائم رہے تو اہل قلم بھی حرمتِ قرطاس و قلم کا پرچم بلند رکھنے کی خاطر سینہ سپر رہنے کی روایت میں فرق نہیں آنے دیں گے ۔

اس مرحلے پر یہ کہنا بھی نادرست نہ ہوگا کہ جمہوری قدریں اور روایات اتنی توانا ہو گئی ہیں کہ کوئی مہذب معاشرہ انھیں نظرانداز کرنے کی جرأت و جسارت نہیں کر سکتا ۔ ماضی قریب میں وطن عزیز میں اظہارِ رائے کی آزادی کی جو جہتیں سامنے آئی ہیں اور امکانات کی جو قندیلیں روشن ہوئی ہیں ، اب انھیں بجھایا نہیں جا سکتا ۔ زندگی کی پیش رفت کا سفر جاری ہے ۔ آزادی اور انسانی زندگی کا ہر آنے والا لمحہ ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ بنتے جائیں گے اور وقت کے ساتھ دیکھی اور ان دیکھی زنجیریں بکھرتی جائیں گی ، کیونکہ فیض احمد فیض کے درج ذیل چار مصرعے حرمتِ قرطاس و قلم رکھنے کے سلسلے میں قلم قبیلے کے لیے کل بھی منشور کا درجہ رکھتے تھے اور آج بھی ہمارا اعلان نامہ ہیں :

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا ، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ستمبر ۱۹۹۲ء

# شہر آشوب

ملول تھا دل آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا ، اک خراش بھی نہ رہی
(فیض)

آج جن حالات میں ہم اپنے معاشرے میں جی رہے ہیں ، انھیں سنگین نہ کہنا اظہارِ صداقت سے روگردانی کرنا ہے ، خصوصیت کے ساتھ ہمارا گردوپیش یہی منظرنامہ پیش کر رہا ہے ۔ پورا معاشرہ عدمِ تحفظ کی مکمل گرفت میں ہے ۔ اندرونِ سندھ کی کیفیت شہروں سے زیادہ خراب ہے ۔ اب لوگ ایک دوسرے سے ملتے وقت حال احوال پوچھنے کے بجائے یہ پوچھتے ہیں کہ تمھارے گاؤں سے کتنے لوگ اغوا برائے تاوان ہوئے ، کتنی ڈکیتیاں ہوئیں ، کتنے قتل ہوئے وغیرہ وغیرہ ۔ شاہیں ویران و سنسان ہو گئی ہیں ۔ اب تک ہوائی سفر غیر محفوظ نہیں ہوا ہے ، ورنہ دیگر تمام ذرائع سفر خطرۂ جاں سے خالی نہیں ۔ شہری زندگی کے افق پر خوف و ہراس کے سائے ہر سمت منڈلاتے رہتے ہیں ۔ اب زندگی کے نئے رویے اور طور طریقے پروان چڑھنے لگے ہیں ۔ لوگوں نے جرائم پیشہ عناصر کے سامنے اپنے سر خم کر لیے ہیں اور

مجرموں کے گھروں میں داخل ہونے کے بعد ان سے سرخ روئی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے آداب سیکھ لیے ہیں اور ان کے ساتھ انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنے اور دستِ تعاون دراز کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ ایسے جرائم پیشہ عناصر جو خواتین اور بچوں کے ساتھ زیادتی سے گریز کرتے ہیں، انھیں سراہا جانے لگا ہے۔ قانون نے لاقانونیت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں اور شہریوں کو جنگل کے قوانین کے احترام کی عادت پڑتی جا رہی ہے۔ ریاستی مشینری اپنے بنیادی فرائض، یعنی شہریوں کی جان و مال کا تحفظ اور معاشرے میں امن و امان قائم رکھنے سے معذور ہو چکی ہے۔ سرکاری ایجنسیوں کی جگہ نجی ایجنسیوں نے معاشرے کے مختلف حصوں اور تجارتی اداروں میں تحفظ اور سلامتی کی ذمے داری قبول کر لی ہے۔ اپنی جان و مال کا تحفظ کرنا ایک عیاشی کا تصور بن کر ابھر رہا ہے۔ کلاشنکوف کلچر اب معاشرے کا معتبر اور مستند کلچر ہے اور اس کلچر کے تحت زندگی برتنے کی ذمے داری شہریوں پر عائد کر دی گئی ہے اور اس سے انحراف کرنا خطرات کو دعوت دینا ٹھہر چکا ہے۔ اس اجمالی صورتِ حال کی تفصیلات بیان کرنا بھی خالی از خلل نہیں رہا:

یا خوف سے درگزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے، اک بات ٹھہر جائے

یہ صورتِ حال ہمارے معاشرے کو جہاں ایک طرف نراجیت کے اندھیروں سے قریب تر کرتی دکھائی دے رہی ہے تو دوسری طرف فسطائیت کی ہولناکیوں تاریکیوں کی طرف ڈھکیلتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ معاشرہ رواداری سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور معاشرتی زندگی تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدروں سے انحراف کے راستے پر گام زن ہوتی جا رہی ہے۔ قومی شعور پر تنگ نظریوں کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جمہوری اقدار پامال ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ طرح طرح کے منفی رجحانات نئے ضوابطِ حیات کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ثقافتی زندگی کے نئے معیارات متعین ہو رہے

ہیں ۔ جبر و استحصال کی نئی نئی شکلیں ابھر رہی ہیں اور تشدد و دہشت گردی کا عفریت
چہار سمت سے معاشرے کو اپنے حصار میں لے رہا ہے ، لوگ خاموش تماشائی ہونے
پر مجبور ہیں بلکہ جبر و تشدد کا نشانہ بننے والوں کو ناعاقبت اندیش اور حماقت ہی کے
طعنے دیے جاتے ہیں ۔ جبر و تشدد کے حضور سرنگوں رہنا آدابِ زندگی کا زریں اصول
بتایا جا رہا ہے ۔ ذرائع ابلاغ ، جو ایک عرصے سے سچائیوں سے چشم پوشی کی روش
اپنائے ہوئے تھے ، اب جھوٹ کو سچ اور حقیقت کے طور پر پیش کر رہے ہیں ۔
جناب ضمیرِ نیازی کی تازہ تصنیف Press Under Siege صحافتی شعبے کے
المیے کی منھ بولتی تصویر ہے ۔ ان کی اس سلسلے کی پہلی تصنیف Press
Under Chains اخبارات پر ریاستی مشینری کے جبر کی داستان تھی ۔ یہ وہ
عوامل ہیں جو معاشرے کو فسطائیت کی راہ پر گام زن کرنے کے درپے ہیں ۔

ماضی قریب میں ہندوستان سے آئے ہوئے ایک بزرگ شاعر اور دانش ور
جناب غلام ربانی تاباں نے اپنے ملک کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جو
ہمارے ملک اور معاشرے کے لیے بھی یکساں اہمیت کی حامل ہیں ۔ انھوں نے
ہندوستانی معاشرے میں فسطائیت کے ابھرتے ہوئے نقوش کو اجاگر کرتے ہوئے یہ
بات کہی کہ اگر ہندوستانی معاشرہ جمہوریت اور سیکولرزم (secularism) کی راہ
سے ہٹ گیا اور وہاں فاشزم (fascism) نے اپنے قدم جما لیے تو ہندوستان
(بھارت) گویا ایک Hindu State بن جائے گا جہاں نہ صرف اقلیتیں دوسرے
درجے کی شہری بن جائیں گی بلکہ پورا معاشرہ ہول ناک صورتِ حال سے دو چار ہو
جائے گا اور قومی سلامتی و یک جہتی خوابِ پریشاں بن کر رہ جائے گی ۔ چنانچہ انھوں
نے ادیب برادری سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے قلم کے علاوہ اس صورتِ حال سے
نبرد آزما ہونے کے لیے میدانِ عمل میں نکلیں ، کیونکہ اگر معاشرہ فسطائیت کی لپیٹ
میں آگیا تو مہذب زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا اور اپنے منصب و کردار

سے محروم ہو کر شر کی قوتوں کا آلۂ کار بن جائے گا۔ تاباں صاحب کی ان باتوں سے مجھے تیس کی دہائی کے اوائل میں فسطائیت کے خلاف ادیبوں کے محاذ کی تشکیل کی یاد تازہ ہوئی، خاص طور پر اسپین میں جمہوریت کے تحفظ کی لڑائی میں ادیبوں کی بحیثیت سپاہی شمولیت کی زریں داستان حافظے میں تازہ ہو گئی جو ہٹلر اور مسولینی کی زیرِ قیادت فاشزم (fascism) کے بڑھتے ہوئے خطرے کے خلاف صف آرا ہوئے تھے۔ جناب غلام ربانی تاباں نے اپنے ملک میں فسطائیت کے ابھار کے پس پشت بنیاد پرست طاقتوں کی عمل داری کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ بات بتائی کہ گزشتہ دو دہائیوں سے وہاں احیا پرستی کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں اور ان تحریکوں کے نتیجے میں وہاں کی قومی سیاست اور قومی زندگی پر ان کے منفی نقوش اجاگر ہو چکے ہیں اور ان کی پیش رفت تشویش ناک ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اس ایقان کا اظہار کیا کہ ان کے خلاف مزاحمت کی تحریک کمزور نہیں ہے بلکہ عوام کی بھاری اکثریت کی تائید اسے حاصل ہے، فسطائیت کی طاقتیں البتہ بہت منظم ہیں۔ آج بھی اگر فسطائیت مخالف طاقتیں متحد ہو کر فسطائیت کے خلاف مزاحمت کے لیے کھڑی ہو جائیں تو بنیاد پرستی و احیا پرستی کا طلسم پاش پاش ہو جائے گا اور خرد افروزی و روشن خیالی کی لہریں حاوی طاقتوں کے طور پر معاشرے کو فسطائیت کے عذاب سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

ہمارے اپنے ملک اور معاشرے میں بھی کم و بیش یہی صورتِ احوال ہے ہرچند کہ منفی رجحانات حاوی رجحانات کے طور پر ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں، مگر میرا ایمان ہے کہ خاموش اکثریت کو مثبت رجحانات کی تائید میں بیدار کرنے کی جدوجہد کی جائے تو ناکامی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔ یہ بات بہرحال اپنی جگہ ناقابل تردید حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ منفی تحریکیں اور رجحانات آسمان سے نازل نہیں ہوتے بلکہ معاشرے میں پائے جانے والے حالات

ہی ان کے ذمے دار ہوتے ہیں ۔ آج ہماری قومی و معاشرتی زندگی جن خطرات میں گھری ہوئی ہے، یہ صورتِ حال ایک دن میں پیدا نہیں ہوئی ۔ گزشتہ چار دہائیوں میں سماجی ناانصافیوں کی جس طور پر پرورش کی گئی اور انھیں پروان چڑھایا گیا ہے، آج کی صورتِ حال اس کا منطقی نتیجہ ہے، لہذا معاشرے کو درپیش نراجیت اور فسطائیت کے خطرات سے نکلنے کے لیے خصوصی سطح پر سماجی ناانصافیوں اور جبر و استیصال کا خاتمہ ہونا ناگزیر ہے ۔ سماجی امن کا خواب سماجی ناانصافیوں کے خاتمے کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ۔ شاعروں، ادیبوں اور قلم کاروں کو اپنے قلم کے زور سے رائے عامہ کو بیدار کرنے کا فرض ایک چیلنج کے طور پر قبول کرنا ہو گا ۔ معاشرے کو اس سنگین صورتِ حال کی دلدل سے نکلنے کے لیے کچھ کرنا ضروری ہے اس پر تفکر کرنے میں تاخیر کی قطعاً گنجائش نہیں ہے ۔ یہ تفکر اور پھر اس تفکر پر عمل انفرادی و اجتماعی سطح پر بلاتاخیر شروع کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے، کیونکہ:

خاکِ رہِ جاناں پر کچھ خوں تھا گرو اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اتر جائے
(فیض)

مارچ، ۱۹۹۲ء

# مرثیے کا مستقبل

سبک ہو چلی تھی ترازوائے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

میر انیس کو اپنے عہد میں جب اردو نثر کا غلبہ محسوس ہونے لگا تو انھوں نے مرثیہ نگاری میں اپنی خلاقیت پر جہاں اعتماد کا اظہار کیا تھا، وہیں اپنی مرثیہ نگاری کے حوالے سے پوری اردو شاعری کا بھرم قائم رہنے کا برحق و برملا دعویٰ کیا تھا۔

اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں جن اصنافِ سخن کا نام نمایاں طور پر زیرِ غور آئے گا، ان میں غزل کے بعد مرثیہ ہے۔ تاریخ ادب اردو کا طائرانہ مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اردو شاعری کی متعدد اصناف یا تو کلیتہً صفحۂ قرطاس سے محو ہو گئیں یا ان اصناف کی دھندلی شبیہیں باقی رہ گئی ہیں۔ بالفاظِ دیگر متعدد اصنافِ سخن سفرِ ارتقا میں گم ہو گئیں یا گم ہو جانے کے مراحل میں ہیں مثلاً ریختی، واسوخت، قصیدہ وغیرہ۔ مثنوی بھی اس فہرست میں شامل کی جا سکتی ہے جو روبہ زوال ہے جبکہ مرثیہ اردو شاعری کی ایک توانا صنف بن کر ابھری ہے۔ غزل کو اگر اولیت کا درجہ اس ضمن میں حاصل ہے تو مرثیہ، غزل کے بعد کسی دوسری صنف سے ثانوی حیثیت نہیں رکھتا۔ نظم نگاری کی

بہت سی حیثیتیں سامنے آئی ہیں، پابند، غیر پابند و آزاد نظم۔ ان اصناف کا ارتقائی سفر بہت مختصر عرصے کا ہے۔ ان میں سے بیشتر کی تاریخ پیدائش بیسویں صدی کی ٹھہرے گی۔ ان کی ترقی غیر معمولی کہی جائے گی، مگر ارتقائی سفر میں مرثیے کا حقیقی منصب و مقام نظم سے کہیں بلند و وقیع ٹھہرے گا۔ مرثیہ، تاریخِ ادبِ اردو میں چار سو برسوں کے حوالے رکھتا ہے۔ کم و بیش یہی تاریخی عمر غزل کی ٹھہرے گی۔ اردو ادب میں مرثیے کو غزل پر اس ضمن میں سبقت اور فوقیت حاصل ہے کہ خاصی قدیم اور توانا روایت فارسی زبان میں بھی ملتی ہے، مگر مرثیہ ایک ایسی صنف ہے جس کی مثال دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ اس میں شک نہیں کہ مرثیے کی ابتدا بھی فارسی زبان میں عہدِ صفوی میں تقریباً چار سو سال قبل ہوئی تھی اور محتشم کاشانی پہلے مرثیہ گو شاعر ہونے کا شرف رکھتے ہیں، مگر یہ روایت بڑی کمزور رہی اور ادبِ فارسی میں مرثیے کا قابلِ ذکر فروغ نہیں ہو سکا۔ اردو زبان میں دیگر اصناف کی طرح مرثیہ بھی فارسی زبان کی دین ہے، مگر مرثیے کے عہدِ طفولیت کے حوالے سے فارسی مرثیے کا ذکر ضرور آئے گا لیکن اس کے عہدِ شباب کے حوالے سے نہیں۔ اس حوالے سے اردو مرثیے کو اس کے عہدِ شباب ہونے کا فخر حاصل ہے اور آج اردو ادب بلا شرکتِ غیرے صنفِ مرثیہ کی سب سے بڑی امین ہے۔

گزشتہ دنوں ادارۂ طلوعِ افکار نے لاہور اور اسلام آباد سے آئے ہوئے دو مرثیہ نگاروں کی پذیرائی کے لیے مرثیہ فاؤنڈیشن کے تعاون سے رثائی ادب پر ایک مذاکرہ منعقد کیا جس میں ملک کے بعض نام ور مرثیہ گو شعرا اور نقادانِ فن نے شرکت کی اور اپنے خیالات و آرا سے شرکائے مذاکرہ کو مستفید کیا تھا۔ اس مذاکرے میں تاریخِ مرثیہ سے لے کر امکاناتِ مرثیہ پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ شرکائے مذاکرہ نے مرثیے کے ماضی حال اور مستقبل کے حوالے سے اہم نکات کے ساتھ ساتھ اسے درپیش مسائل اور تقاضوں (challenges) پر روشنی ڈالی۔ کچھ شرکائے مذاکرہ کی رائے تھی کہ مرثیے

کی ہیئت میں تجربے کا دروازہ کھلا رکھا جائے اور مسدس کا مرثیے کو پابند نہ کیا جائے۔
اس رائے سے اختلاف رکھنے والوں کا کہنا یہ تھا کہ مسدس کی ہیئت چار سو سال کے سفرِ
ارتقا کا حاصل ہے اور تجربات سے گزر کر ہی مرثیہ مسدس کی ہیئت سے وابستہ ہوا ہے
ان کے خیال میں مرثیے کے مجلسی مزاج اور مواد کی موثر ادائیگی ، ہر دو اعتبار سے
مسدس موزوں ترین فارم ہے۔

یوں تو ہر زبان میں غم انگیز مضامین نظم کیے گئے ہیں اور کچھ افراد کی دردناک
موت کا منظوم بیان بھی مختلف فارم میں ملتا ہے ، خود اردو زبان میں بھی کچھ شخصی
مرثیے لکھے گئے ہیں ، مگر صنفِ مرثیہ ، تاریخ ادب میں ارضِ کربلا اور ذکرِ حسینؑ سے
عبارت ہے۔ کربلا اور حسینؑ ، صنفِ مرثیہ کا محور و مرکز ہیں ، یہ نکتہ مذاکرے میں
متفقہ طور پر سامنے آیا۔ قدیم و جدید مرثیے میں کرداروں اور واقعات کی پیش کش کے
حوالے سے کچھ اختلافِ رائے بھی کیا گیا۔ اس اختلافِ رائے میں مرثیے میں رویوں کی
تبدیلی زیرِ بحث آئی جو خاص طور پر جوش ، جمیل مظہری اور آل رضا کے مرثیوں میں نظر
آتی ہے۔ جدید مرثیے میں امام حسینؑ کی مظلومیت کے مقابلے میں ان کے نصب العین
کی فتح حق کی فتح ، سچائی کی فتح اور عدل کی فتح ، کو زیادہ نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔
معرکۂ کربلا جو ایک معرکۂ خیر و شر تھا ، اس معرکے میں امام حسینؑ کو خیر کے علم بردار
اور فاتح کے طور پر پیش کرنے کو جدید مرثیے میں زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ جدید مرثیے
میں رثائی پہلو پس منظر میں چلا گیا ہے جو روحِ مرثیہ کے منافی ہے۔ یہ رائے مجلس میں
تسلیم کی گئی اور مرثیے کے سفر کو رثائی تقاضوں سے ہم آہنگ رکھتے ہوئے جاری رکھنے
کی بات چلی۔

مرثیے کے ارتقا کے ساتھ اس کی محدود اپیل کے حوالے سے یہ بات بھی کی گئی
کہ مرثیے سے غیر معمولی دلچسپی اور وابستگی شیعہ فرقے کو رہی ہے اور شیعی سلطنتوں میں
مرثیے کی سرپرستی ہوئی لہٰذا ایک خاص فرقے سے یہ صنف منسوب ہو گئی ، چنانچہ

دوسرے فرقوں کے ہاں مرثیے سے ایک فاصلہ اور reservation پایا جاتا ہے تو یہ کوئی غیر منطقی اور غیر متوقع بات نہیں۔ اس ضمن میں یہ بات زیر بحث آئی کہ وقت کے ساتھ مرثیے میں مذہبیت کی بہ نسبت ادبیت ابھرتی رہی ہے اور جیسے جیسے مرثیے میں ادبیت ابھرتی جائے گی، مرثیے کی اپیل میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اس کی محدودات معدوم ہوتی جائیں گی۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ مرثیے میں سانحۂ کربلا اور ذکرِ حسینؑ کو ثانوی حیثیت دی جائے یا سانحۂ کربلا اور کردارِ امام کا کوئی خیالی اور مفروضوں پر مبنی interpretation سامنے لاکر مرثیے کی ادبیت کو فروغ دیا جائے مرثیہ اپنے ماضی کے ساتھ حال اور مستقبل کا اس طرح سفر جاری رکھے کہ اس کی ادبی صورت نکھرتی چلی جائے مگر اس کا رثائی پہلو بہر حال نمایاں رہے۔

مرثیے کا ارتقا جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، جاری و ساری ہے، ہر چند کہ میر انیس کے یہاں مرثیے کو perfection حاصل ہوا اور نقطۂ عروج نصیب ہوا۔ مرثیے کی تاریخ میں میر انیس کا وہی مقام ہے جو غزل کی تاریخ میں مرزا غالب کا ہے۔ غزل غالب کے یہاں اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ نقطۂ عروج پر ہے اور یہ کہنا آسان نہیں کہ کسی دوسرے شاعر نے غزل کے نئے امکانات کی سمت میں کوئی واضح پیش رفت کی ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ ایک مسلمہ سچائی ہے کہ غزل غالب کے بعد وہیں نہیں کھڑی ہے جہاں مرزا غالب نے اسے چھوڑا تھا۔ غالب کے بعد بھی غزل کا ارتقائی سفر جاری و ساری ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہر چند کہ میر انیس نے مرثیے کو تمام تر امکانات سے ہم کنار کیا اور اسے اوجِ ثریا بخشا اور یہ کہ میر انیس سے بڑا تو کیا، اس کے ہم پلہ بھی کوئی مرثیہ گو شاعر ہنوز پیدا نہیں ہوا، مگر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مرثیہ، انیس کے عہد میں ہے اور وہیں کھڑا ہے جہاں اسے میر انیس نے چھوڑا تھا۔ بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ صنفِ مرثیہ ارتقا پذیر ہے اور انیس کے بعد مرثیہ اپنے مواد، لہجے، رویے اور موضوعات، ہر اعتبار سے پیش رفت کا سفر کر رہا ہے

اور مرثیے کی تاریخ میں معتبر ترین نام اپنی جگہ پا چکے ہیں اور نئے نام اپنی جگہ کا تعین کرانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

مذکورہ مذاکرے میں مرثیہ، ادب کی ایک صنف کے طور پر زیر بحث رہا اور اس کے ماضی، حال و مستقبل کا ادبی تناظر میں جائزہ لیا گیا اور اردو مرثیے کی قدر و قیمت کا تعین ادب کے معیار و میزان پر رکھ کر کیا گیا۔ اس مذاکرے میں ادب کی آفاقیت کا ذکر بھی آیا تو مرثیے میں آفاقی قدروں کے برتے جانے کے حوالے بھی دیے گئے۔ اس مرحلے پر ادب کے بنیادی وصف و کردار پر تھوڑی سی گفتگو اس مذاکرے کا ماحصل طے کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

ادب کی آفاقیت کی بات جب کی جاتی ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ شاعر یا وہ شاعری جسے آفاقی ہونے کے سند دی جا رہی ہے، اس سے یا اس میں جن خیالات، احساسات، نظریات اور اقدار کا اظہار ہو رہا ہے، ان کو کسی خاص فرقے، قوم، مذہب، نسل و رنگ سے منسوب و مختص ہونے کے بجائے ان کا تعلق بنی نوع انسان سے ہونا چاہیے، عالمی ادب میں وہ ادبی ورثہ آفاقی کہلایا ہے جو اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ ادب بنیادی طور پر سیکولر کردار کا حامل ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں سیکولرزم کی اصطلاح کو بڑے گم راہ کن مفہوم سے نوازا گیا ہے اور اسے لادینیت اور لامذہبیت کا ہم معنی ہونے کا تاثر دیا گیا ہے جو سرے سے غلط اور بے بنیاد ہے۔ سیاسی معنوں میں سیکولرزم، مذہب کے معاملے میں ریاست کی غیر جانب داری ہے اور عمومی معنوں میں غیر فرقہ واریت، خرد افروزی اور روشن خیالی ہے نہ کہ دہریت اور مذہب مخالف کوئی نظریہ و فلسفہ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف زبانوں کے شعرا جن کا مختلف اقوام و مذاہب سے تعلق ہے مگر وہ ضمیر بشر اور روح عصر کی ترجمانی کرتے ہیں، وہ کسی خطے، کسی قوم، کسی مذہبی فرقے اور کسی رنگ و نسل کے حوالے سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ وہ انسانی اقدار کے حوالے سے جانے جاتے ہیں جو ان کی ادبی زندگی میں قوت

محرکہ کا درجہ رکھتی ہیں ۔ ادب سیکولر ان معنوں میں ہوتا ہے کہ ادب کا خمیر فرقہ واریت کی کیمیا سے اٹھتا ہے اور انسانی اخوت کا داعی ہوتا ہے ۔ ادب اگر محدود دائرے میں ہے تو اس کی اپیل بھی محدود دائرے تک ہو گی ۔ دینی اور مذہبی شاعری کی محدودات اسی نوعیت کی ہیں ۔ اردو شاعری میں غزل کی لازوال اور روزافزوں مقبولیت کا بنیادی سبب اس کا سیکولر ہونا ہے ۔ غزل کے مقابلے میں مرثیے کی محدودات ناقابلِ فہم نہیں ہیں ۔ علاوہ بریں عمومی غزل گوئی سہل ترین صنفِ سخن ہے ۔ بقول جناب مظہر جمیل: " دراصل غزل پر حالی سے لے کر اب تک جتنے اعتراضات وارد ہوئے ہیں ، وہ اس عمومی بھیڑ بھاڑ بلکہ بھیڑ چال کی وجہ سے عائد ہوتے رہے ہیں جو اس صنفِ سخن کی غیر معمولی مقبولیت اور گوناگوں ناگزیریت کی پیدا کردہ ہے جس کی موجودگی میں ایک اوسط شاعر کو ایجاد و اختراع کی کوئی خاص زحمت نہیں اٹھانی پڑتی ۔ قافیے اور ردیف کی پابندیاں دراصل پابندیوں سے کہیں زیادہ تن آسانیوں کا جواز بن جاتی ہیں ڈھلی ڈھلائی لفظیات ، ترشی ترشائی تراکیب و محاکات ، چبے چبائے مضامین ، بنے بنائے مناظر ، سجی سجھائی روایتیں اور ان کی نپی تلی تقلید " .... مرثیے کے باب میں اس قسم کے اعتراضات کے لیے نہ تو گنجائش ہے اور نہ جواز ۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ فقرہ " بگڑا شاعر مرثیہ گو " کسی مفہوم ، تناظر اور حوالے سے میرے نزدیک معنویت کا حامل نہیں ہے ۔ مرثیہ ، غزل کے مقابلے میں مشکل صنفِ سخن ہے ، لہٰذا مرثیے کی قبولیتِ عام کو غزل سے ہٹ کر دیکھنا ہو گا کہ یوں بھی مرثیہ اپنی طوالت کی بنا پر عام ادبی جریدوں میں غزل و نظم کی طرح تواتر سے شائع نہیں ہو سکتا اور یہ بات دیگر ابلاغِ عامہ کے ذرائع پر صادق آتی ہے ۔ مرثیے کی ان محدودات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے مگر ان حوالوں سے مرثیے کی اپیل اور ساکھ کو مشروط نہیں کیا جا سکتا ۔

مرثیے نے جہاں اردو شاعری میں المیہ اور رزمیہ شاعری (epic poetry) کی روایت کی کسی حد تک کمی پوری کی ہے تو وہاں اس حوالے سے مرثیے میں عالمی

ادب کے معیار و میزان پر عظیم شاعری (great poetry) ہونے کے امکانات خاصے پائے جاتے ہیں، جبکہ اردو شاعری کی بلاشرکت غیرے آبرو ہونے اور اپنی تمام تر عظمتوں، رفعتوں اور قبولیتِ عام کے باوجود اپنی مخصوص ہیئت کے ساتھ غزل میں اصطلاحی معروف معنوں میں عظیم شاعری (great poetry) ہونے کے امکانات اور potentialities سرے سے مفقود ہیں۔ خاص طور پر میر انیس کے مرثیوں کو ان معیارات پر پرکھا جائے جو عظیم شاعری کے لوازمات قرار دیے جاتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ انھیں عظیم شاعری کے کلب کی مکمل رکنیت نہ سہی تو associate membership ضرور مل سکتی ہے۔ میر انیس کے مرثیوں میں جہاں سانحۂ کربلا کی غیر معمولی موثر تصویر کشی ملتی ہے، وہاں امام حسینؑ کی شخصیت کے ایسے گوشے اجاگر ہوئے ہیں جنھوں نے امام حسینؑ کو تاریخ انسانی کی ان چند برگزیدہ ہستیوں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے جس فہرست میں سقراط، حضرتِ ابراہیمؑ (بمقابل نمرود)، حضرتِ موسیٰؑ (بمقابل فرعون) اور حضرتِ عیسیٰؑ کے اسمائے گرامی شامل ہیں کہ ان تمام برگزیدہ ہستیوں نے ابدی معرکۂ خیر و شر میں جو کردار ادا کیا تھا، اس سنت کی پیروی اور پاس داری امام حسینؑ نے بطریق احسن کی۔ امام حسینؑ کی تاریخی شخصیت کی عظمت مسلم ہے، مگر ان کی تاریخی شخصیت سے قطع نظر وہ تاریخ انسانی میں آج ایک علامت بن چکے ہیں، شر کے مقابلے میں خیر کا دفاع کرنے والی شخصیت۔ باطل کے مقابل حق کا علم بلند کرنے والی شخصیت کے حوالے سے یہ منصب تاریخ انسانی میں چند ہستیوں کو نصیب ہوا ہے جن میں امام حسینؑ شامل ہیں، یہ بذاتِ خود ایک بڑی عظمت ہے۔ واقعۂ کربلا بھی رسمی طور پر اپنی تاریخی حیثیت سے کہیں زیادہ ایک علامت اور استعارہ بن چکا ہے جو سانحۂ کربلا کی عظمت و رفعت کی اضافی سند ہے۔ سانحۂ کربلا کے اس منصب کو میرے نزدیک میر انیس اور ان کے بعد ان مرثیہ گو اکابر کا کارنامہ کہنا چاہیے جنھوں نے اپنی خلاقیت سے سانحۂ کربلا (Tragedy of

(Karbala) کو ایک عظیم انسانی المیے (great human tragedy) کی حیثیت سے پیش کیا اور ذہن انسانی پر اس حیثیت سے اس کا نقش ثبت کیا۔

مرثیے کی کامیابی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ (میر انیس کے حوالے سے خصوصی طور پر) کربلا، کوفہ، شام اور سانحۂ کربلا کے متعدد کردار دیگر اصناف میں آج تلمیحات، علامات اور ستعارے کے طور پر برتے جا رہے ہیں۔ اسے مرثیہ کا غیر معمولی influence کہنا چاہیے اور اسے اس کے روشن تر مستقبل کی ضمانت سمجھنا چاہیے۔ غرض یہ کہ مرثیے کا ارتقائی سفر، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، جاری و ساری ہے اور یہ سفر پیش رفت کا سفر ہے۔

مرثیہ، وقت کے ساتھ اپنے ادبی منصب پر کلیتہً فائز ہونے کے سفر پر گام زن ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ مرثیے میں آفاقی قدریں وقت کے ساتھ بڑھ رہی ہیں اور میرے خیال میں مرثیے کا کئی دہائیوں سے سیکولر سفر شروع ہو چکا ہے۔ امام کے کردار کا یہ پہلو میرے اس استدلال کی تائید میں ہے جو ان دو مصرعوں میں پیش کیا گیا ہے:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی، ہمارے ہیں حسینؑ

امام کا انسانی تاریخ کے ایک ہیرو اور سانحۂ کربلا کا انسانی تاریخ کے ایک عظیم المیے کے طور پر تسلیم کیا جانا مرثیے کا کارنامۂ عظیم قرار دیا جائے گا، اور یہ کارنامہ اس کے ادب کی آفاقی قدروں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ مشروط ہے۔

ستمبر، ۱۹۹۵ء

# سید سلطان انور اور ہم عصر دانش

"کیا ہمارے دانش ور روشنی کے سفر میں اپنے ابنائے وطن کی رہ نمائی کر سکیں گے؟" یہ اختتامی فقرہ معاصر ماہ نامۂ ادبی لیل و نہار، کراچی کے اداریے کا ہے جس کا عنوان 'اہل دانش کی مجرمانہ خاموشی' ہے۔ عنوان کی جارحیت سے زیادہ اس میں کارفرما جراحت نے پہلے تو اس اداریے کو پڑھنے پر مجبور کیا اور پھر سوچنے پر بلکہ سوچتے رہنے پر۔ اس جریدے کے مدیرِ مسئول جناب سید سلطان انور ملک کے جانے پہچانے دانش ور اور قلم کار ہیں۔ اس مختصر سی تحریر میں معاشرے کے لیے ان کے کرب و اضطراب کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ وہ صاحبِ فکر و نظر ہونے کے ساتھ ایک حامل درد صاحبِ قلم ہیں۔ اس تحریر کے متن سے اتفاق کرنے کے ساتھ اختلاف کرنے کے بھی مساویانہ امکانات ہیں۔ انھوں نے ادیب و دانش ور کے کردار اور منصب کے تعین کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ان کا یہ کہنا درست بلکہ برحق ہے:

"دانش ور، ادیب، صحافی، شاعر اور اساتذہ، یہ سب کسی بھی معاشرے کا سب سے اہم، موقر اور محترم حصہ ہوتے ہیں۔ اہل دانش امروز و فردا پر گہری نظر رکھتے ہیں اور معاشرے کے دوسرے افراد ان

کی جانب رہ نمائی کے لیے دیکھتے ہیں۔ زندہ معاشروں میں دانش ور قائدانہ فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان کی تحریریں، تجزیے اور تخلیقات معاشرے کو روشنی سے منور کرنے کا وسیلہ بنتی ہیں۔ قیادت کے فرائض کا ایک بڑا حصہ اہل سیاست کے کاندھوں پر بھی ضرور ہوتا ہے، مگر سیاستداں بالعموم مصلحتوں کا شکار رہتے ہیں اور ان کی کاوشوں کا محور زیادہ تر وقتی فوائد، حصول اقتدار اور تحفظ رہتا ہے۔ دانش ور وقتی فوائد سے بہت بلند ہو کر کام کرتے ہیں۔ ان کا اعتبار ان کے خلوص اور محنت ہی سے قائم ہوتا ہے۔ اہل دانش کا کام آسان نہیں ہے۔ انھیں آفاقی قدروں اور مقامی مقتضیات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہوتی ہے۔ وہ عالمی تصورات کا مقامی کوائف پر انطباق کرتے ہیں، آفاقیت اور مقامیت کے درمیان پل بنتے ہیں۔ دانش ور طبقہ وسیع تر انسانیت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اسے مصلحتوں، سرحدوں اور وابستگی کے چھوٹے چھوٹے دائروں سے بلند ہو کر وسیع تر حلقۂ انسانیت کا مونس و غم خوار بننا ہوتا ہے"۔

قائدانہ یا رہ نمایانہ فرائض کے حوالے سے ادیب و دانش ور کے معاشرے سے رشتہ و ارتباط کی بات تشریح طلب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے سفر میں اہل دانش کا حصہ بڑا گراں قدر اور وقیع ہے۔ اہل فکر و دانش نے اپنے عہد ہی کو نہیں بلکہ آنے والے ادوار اور تاریخ پر بھی اپنی فکر و دانش کی اثر پذیری قائم رکھی ہے۔ کون ہے جو قدیم یونان کے مفکروں، فلسفیوں اور دانش وروں کے افکار کی اثر پذیری کا آج بھی انکاری ہو سکے! افلاطون اور ارسطو کے بعد متعدد مسلم مفکروں اور دانش وروں مثلاً ابن خلدون، فارابی اور ابن رشد جیسے اکابرین فکر و دانش کے اثرات سے تاریخ انسانی کا کوئی طالب علم کیونکر منکر ہو سکتا ہے؟ برصغیر ہی کو لے لیجیے،

سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار کے افکار و نظریات کے معاشرے پر جو ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے، ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ادب کی قلم رو میں غالب کی فکری اور فنی حکمرانی کے آج بھی سبھی معترف ہیں۔ علامہ اقبال نے بیسویں صدی میں پورے مسلم معاشرے کو جس طرح اپنی روشنیٔ طبع سے منور کیا، اس سے کون واقف نہیں؟ فکرِ اقبال نے شعر و ادب کی دنیا کو پہلی مرتبہ ان گوشوں سے روشناس کرایا جن سے دنیائے شعر و ادب پہلے قطعی ناآشنا تھی۔ ان کی فکر و دانش کی اثر پذیری کی کثیرالجہتی اور ہمہ گیری کے سبھی معترف ہیں۔ علامہ اقبال کے علاوہ علامہ نیاز فتح پوری اور جوش ملیح آبادی نے بھی معاشرے کی فکری پیش رفت میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ادب کے شعبے میں، خاص طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور متاثر اہلِ فکر و دانش کی ایک خاصی بڑی فہرست ہے جنھوں نے مختلف اصنافِ ادب میں اپنے قلم کے جادو سے فکر و خیال کی دنیا میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں، معاشرے کی فرسودہ روایات و اقدار کی جگہ زندگی آموز اور زندگی آمیز روایات و اقدار کی بنا ڈالی، ادب کے نئے مفاہیم و مطالب متعین ہوئے، ادب و زندگی میں نئے عہد و پیماں ہوئے، ادب زندگی کی ترجمانی کرنے کے علاوہ اس کی تفسیر و تنقید کے ساتھ اس کی تفہیم کا بھی ذمے دار ٹھہرا، ادب کی تخلیق سماجی ذمے داری قرار پائی اور ادب کو سماجی فریضہ تسلیم کیا گیا....

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ادب و دانش ور نے معاشرے کو ان خطوط پر تبدیل کرنے کے عزمِ صمیم کا اظہار کیا جہاں انسان شرفِ بشر کا دعوے دار ہو، اسے کسی حوالے سے امتیاز و تفریق کا احساس نہ ہو، اسے ذہن و ضمیر کی مکمل آزادی میسر ہو، خوفِ فردا اور عدم تحفظ کے ہر احساس سے بے نیاز ہو۔ جہاں استحصال اور ناانصافی کی زنجیروں کا کوئی وجود اور تصور نہ ہو۔ یہ سب کچھ خواب کہا جا سکتا ہے، مگر یہ خواب ادب کا سرمایہ اور اثاثہ قرار پایا۔ ادبی تحریروں نے جہاں غلامی کی زنجیروں کو پگھلانے کے لیے حدت پیدا کی، وہاں برِ صغیر کے بیمار معاشرے کی بوسیدہ بنیادوں کو بھی منہدم کرنے کا

محرک پیدا کیا، تو ہم پرستی کی جگہ خرد افروز تعقل پسندی اور روشن خیالی کی کرنوں سے معاشرے کے تاریک گوشوں کو منور کیا۔ غرض یہ کہ اہل فکر و دانش کے تاریخ کے سفر میں ایسے گراں قدر contributions ہیں کہ ان پر فخر کے سوا خجالت کا کوئی باب کھولا نہیں جا سکتا۔ بہر حال اس مرحلے پر یہ بات کہنا معنویت سے عاری نہیں کہ ادیب و دانش ور کا منصب و مقام مصلح اور مبلغ کا نہیں ہوتا، خاص طور پر یہ بات اہل ادب کے حوالے سے کہی جا رہی ہے۔ ادیب کسی تحریک کو inspire کرتا ہے، خود اس تحریک کی قیادت کی ذمے داری اسے تفویض کرنا اس کو اپنے منصب سے ہٹانے کے مترادف ہے۔

آزادی کی تحریک کو فروغ دینے اور اس کو مقبول عام بنانے میں ادب کی نگارشات کے حوالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ دنیا کے مختلف انقلابات کے پس پشت اہل دانش کی فکر و دانش کی کارفرمائی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) کے حوالے سے والٹیر (Voltaire) اور روسو (Rousseau) کے افکار کی قدر و قیمت سے کون آگاہ نہیں؟ خود تحریک پاکستان کو مہمیز دینے میں فکر اقبال کی حیثیت مسلم ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کو میں ان کی دانش ورانہ اور مفکرانہ زندگی کا محض ایک ضمیمہ سمجھتا ہوں۔ تحریک پاکستان میں ان کی سیاسی زندگی کا بھی ذکر آتا ہے، مگر وہ ان کی مفکرانہ اور دانش ورانہ زندگی کے ذیل میں ہی اپنا کوئی معنی اور مفہوم رکھتا ہے، اس سے ہٹ کر نہیں۔ ادیب کسی انقلاب کو متاثر کرنے کا کردار ادا کرتا ہے یا کر سکتا ہے تو وہ لپنے قلم اور اپنی تحریر سے ہی کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ کسی ادیب اور دانش ور پر سیاست کے دروازے بند رہنے چاہییں۔ ایک ادیب سیاست داں اور سیاست کار بھی ہو سکتا ہے مگر یہ دونوں منصب جداگانہ ہیں۔ اسی طرح ایک ادیب و شاعر کسی سماجی اور اصلاحی تحریک کی قیادت بھی کر سکتا ہے، کیونکہ معاشرے کا ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس پر یہ

دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا حسرت موہانی کی سیاسی زندگی اور قائدانہ حیثیت اور مقام سے سبھی باخبر ہیں، مگر ان کی شاعرانہ عظمت ان کی تحریروں اور نگارشات کے حوالے سے ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی زندگی اور ان کی سیاسی جدوجہد تاریخ کا زریں باب ہیں، مگر ان کی دانش ورانہ اور ادیبانہ عظمتوں کی اساس ان کی سیاسی جدوجہد نہیں بلکہ ان کی تحریریں اور نگارشات ہیں۔ ادبی زندگی کے ساتھ سیاسی زندگی گزارنا ادب کی شریعت میں حرام نہیں ہے، لیکن ادبی تحریریں ادبی معیارات پر پرکھی جاتی ہیں، کسی سیاسی وابستگی کے حوالے سے نہیں۔ ادب اور غیر ادب کے درمیان واضح خطِ تفریق دیکھا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نعرے بازی اور پروپیگنڈے کو ادب ہونے کی سند حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہونا چاہیے۔ لہذا قائدانہ اور رہنمایانہ فرائض اور منصب کا ذکر اہل ادب و دانش کے حوالے سے کرتے وقت ان حقائق و معروضات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے، گویا ادیب کو ادب کے بنیادی تقاضوں کا پاس رکھ کر کوئی کردار ادا کرنا ہے۔

زیرِ نظر اداریے میں پاکستانی معاشرے کی موجودہ صورتِ حال کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس سے اتفاق نہ کرنا ممکن نہیں۔ ملاحظہ ہو:

"پاکستانی معاشرہ ان دنوں مختلف النوع تبدیلیوں سے گزر رہا ہے، نت نئے مسائل اور تضادات ہیں جو ہماری قومی زندگی کا حصہ بن رہے ہیں، ایک جانب ہم "عالمی ویلج" کا ناگزیر حصہ بن رہے ہیں۔ منڈی کی معیشت نے دنیا کو ایک بڑے بازار میں ڈھال دیا ہے ہم بھی اس عالمی بازار کا حصہ ہیں اور دنیا کی دیگر اقوام سے اقتصادی رشتوں کے حوالے سے مربوط ہو رہے ہیں۔ ذرائع مواصلات کے انقلاب اور سیٹیلائٹ کی محیرالعقول ایجاد نے ہمیں عالمی شہری بنا دیا ہے۔ معلومات اور خبروں کے سیلاب نے ہمارے ذہنوں کو باقی ماندہ

دنیا کے ذہن کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ دوسری جانب ہمارا ابھی معاشرہ داخلی انتشار اور تقسیم در تقسیم کے تکلیف دہ تجربات سے بھی گزر رہا ہے۔ تقسیم کی قوتیں انتہائی بے رحمی کے ساتھ انسانوں کے درمیان خلیج پیدا کر رہی ہیں۔ مذہبی انتہا پسندی اور نسلی و لسانی تفریق نے موت اور خوف کے تحفے عام کرنے شروع کر دیے ہیں"۔

مندرجۂ بالا سطور میں عالمی منظرنامے کا جس اختصار کے ساتھ اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے، وہ صاحبِ اداریہ کی فکر و نظر کی پختہ کاری دلیل ہے۔ اطلاعات کی دنیا میں ربع صدی میں جو ایک جامع اور بھرپور انقلاب آیا ہے، اس انقلاب نے واقعی ایک طرف دنیا کو ایک global village بنا دیا ہے اور دوسری طرف consumerism نے ایک نئے عالمی کلچر کی داغ بیل ڈالنا شروع کر دی ہے جس کا ہم حصہ بنتے جا رہے ہیں، خواہ ہم اسے پسند کرتے ہوں یا ناپسند۔ منڈی کی معیشت اور عالمی بازار کا حوالہ اس سمت ہماری توجہ اور ذوقِ مطالعہ کی رہ نمائی کرتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں جو آج انتشار پایا جاتا ہے اور جس تضادات کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے اس کا بنیادی سرچشمہ وہ عالمی منظرنامہ ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ صاحبِ اداریہ کی بصیرت اور بصارت کا یہ ثبوت ہے کہ انھوں نے اپنے معاشرے کی موجودہ صورتِ حال کو تنزلی اور زوال آمادگی پر محمول نہیں کیا اور نہ انحطاط کا شکار قرار دیا بلکہ اسے انتشار اور چند سنگین مسائل و مشکلات میں گرفتار قرار دیا۔ یہ ان کے سائنسی فکر اور رویے کی دین ہے ورنہ وہ بڑی آسانی سے اخلاقی اور معاشرتی روایات و اقدار کے degeneration کا فتویٰ صادر فرما سکتے تھے، مگر اس منصب پر تو دائیں بازو کے مفکروں اور دانش وروں کی اجارہ داری ہے۔ کوئی روشن خیال اور خرد افروزی کا قائل دانش ور و ادیب یہ اجتہادی غلطی کیونکر کر سکتا ہے، چنانچہ وہ مسائل اور مشکلات جن سے ہمارا معاشرہ دوچار ہے، اس کی تفہیم بھی ممکن ہے اور اس کے نتیجے میں انتشار پر

قابو پانا بھی ناممکن نہیں۔

صاحبِ اداریہ کو یہ شکایت ہے کہ اس صورتِ حال کے باوجود ہمارے اہلِ دانش کچھ زیادہ فعال کردار ادا کرتے نظر نہیں آتے۔ اول تو یہ حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ فعال کردار سے ان کی مراد کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ اگر وہ ادیبوں اور دانش وروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان مسائل و مشکلات کے حوالے سے کوئی تحریک چلائیں، جلسے اور جلوس کا اہتمام کریں اور مظاہروں کا بندوبست کریں تو میرے خیال میں یہ ادیبوں اور دانش وروں سے مطالبہ کرنا ان کے منصب سے ان کو محروم کرنا اور ان کی ادبی زندگی کی نفی کرنا ہے۔ ادیب کے کردار اور معاشرے کے ان جیسے مسائل اور مشکلات پر قابو پانے میں قلم کار کے کردار سے کسی سیاسی کارکن یا ادارۂ خدمتِ خلق کے کسی کارکن کے کردار کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آج کا ادیب و شاعر کیا لکھ رہا ہے، آج کا دانش ور کیا سوچ رہا ہے، کیا وہ موجودہ صورتِ حال کی سنگینی کا ادراک نہیں رکھتا یا ان سے بے گانگی کا اظہار کر رہا ہے یا وہ یاسیت کا شکار ہو گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ ادب میں آج معاشرے کی وہی تصویر کشی ہو رہی ہے جو ہونا چاہیے۔ ادب میں مسائل و مشکلات کا بھرپور ادراک بھی پایا جاتا ہے اور اس کا موثر اظہار اور ابلاغ بھی ہو رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے ادب پاروں کا آپ جائزہ لیں تو ہر زبان میں ان مسائل و مشکلات کا کہیں کھل کر، کہیں علامات و استعارات کی زبان میں آپ کو فراوانی کے ساتھ اظہار ملے گا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ منفی لہریں بھی ان ادب پاروں میں پائی جاتی ہیں، مگر یہ منفی لہریں ادب کا حاوی اور غالب عنصر نہیں ہیں مثبت فکر اور رجحان کا آج بھی ادب میں غلبہ ہے۔ ہر دور کی طرح آج کا ادیب بھی روحِ عصر کی ترجمانی کر رہا ہے اور موثر انداز میں کر رہا ہے۔ ادیب معاشرے کا ضمیر ہے، وہ اسی کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور تسلسل و مستعدی سے پیش کر رہا ہے۔ سہاں میں نے

نثر و نظم ، ہر دو اصناف میں چھپنے والی تحریروں کے حوالے سے یہ بات کہی ہے ۔ اس کا کیا اثر اور impact ہو رہا ہے ، یہ دوسرا سوال ہے ۔ آج افرادِ معاشرہ کی ترجیحات میں ادب کا کیا مقام ہے ، یہ بھی ایک جداگانہ سوال ہے ۔ اسی کے ساتھ یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ ادیب و شاعر و دانش ور کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہوتے ، وہ اسی معاشرے کے افراد ہیں ، ان کی آرزوئیں اور تمنائیں اور ضروریات بھی اس حقیقی دنیا کی ہیں ، کسی خیالی دنیا کی نہیں ۔ ادیب و شاعر کی حسیت اور رویے کی بھی اس حقیقی دنیا میں تہذیب و تکمیل ہوتی ہے ، لہٰذا اگر مادی مفادات ( material considerations ) کا ادیب و شاعر کی زندگی میں بھی عمل دخل ہے تو اسے یکسر مسترد نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لیا جانا چاہیے ، انھیں اس بنیاد پر condemn نہیں کیا جانا چاہیے ۔

بہر حال مجھے صاحبِ اداریہ کے اس کرب و اضطراب کا پاس بھی ہے اور احترام بھی جو انھیں اپنے معاشرے کے حوالے سے ہے ۔ جن مسائل کا انھوں نے حوالہ دیا ہے ، وہ آج اتنے سنگین ہیں کہ ان کی جانب معمول سے ہٹ کر سوچنے اور کچھ کرنے کی ضرورت ہے ۔ ادیب و شاعر اپنے فرائض منصبی اپنی تحریروں میں انفرادی سطح پر ادا کر رہے ہیں ۔ مجھے صاحبِ اداریہ کی اس آرزو سے اتفاق ہے کہ اس انفرادی تگ و دو کے علاوہ کچھ اجتماعی تگ و دو بھی ہونا چاہیے ۔ ماضی میں ایسی روایات موجود ہیں جب ادیب و دانش ور برادری نے سنگین challenges کا اجتماعی کوششوں کے ذریعے مقابلہ کیا ہے ۔ تیس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں فاشزم (fascism) کے خلاف دنیا کے ادیب اور دانش ور اکٹھا ہوئے تھے اور تہذیب و ثقافت کے دفاع کے لیے مشترکہ لائحۂ عمل طے کیا تھا اور ان پر عمل درآمد کے لیے اجتماعی کوششوں کو بھی بروئے کار لایا گیا تھا ۔ وطن کی آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں ادیبوں اور شاعروں نے ترقی پسند تحریک کے فورم سے اجتماعی جدوجہد کی روایت رکھی تھی ، لہٰذا آج وقت کا

تقاضا یہ ضرور بنتا ہے کہ معاشرے کو درپیش سنگین بحران سے نکلنے کے لیے ادیب و
شاعر و دانش ور اجتماعی جدوجہد کی ضرورت پر غور کریں اور اس سمت میں عملی اقدام
کریں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارا معاشرہ اس وقت ایک سنگین بحران سے دوچار
ہے۔ یہ بحران multiple ہے۔ ہماری قومی سیاسی زندگی اصول اور آدرش سے بے
بہرہ ہوتی جارہی ہے۔ آج اصول و آدرش کی بات کرنے والے اگر چند لوگ باقی رہ گئے
ہیں تو انھیں آج کے لغت میں احمق یا کم از کم غیر حقیقت پسند کہا جانے لگا ہے۔ عالمی
منڈی کی معیشت نے سیاست کو بھی، جو کبھی مشن اور آدرش ہوتی تھی، ایک جنس
تجارت (commodity) بنا دیا ہے۔
کامیاب اور نیک نام سیاست کار وہ ہے جو اس جنس تجارت کی خرید و فروخت کرنے
میں ہنر مندی اور چابک دستی سے کام لے اور کسی بھونڈے پن کا ثبوت نہ دے۔ اس
کاروبار میں حب الوطنی اور انسانیت دوستی کی کیا قدر و قیمت ٹھہرتی ہے، اس باب میں
کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ معاشرہ آج اس سیاست کی گرفت میں ہے اور یہ
گرفت روز بروز مضبوط تر ہوتی جارہی ہے۔ ماضی قریب میں قومی سیاست میں تشدد کا
بھیانک عنصر شامل ہو گیا ہے جس نے قومی سیاست کا دھارا اس سمت رواں دواں کر
دیا ہے جو فاشزم کے دریائے بے کنار تک جاتا ہے۔ اصل دانش ور اور ادیب و شاعر اس
صورتِ حال کا بھرپور ادراک رکھتے ہیں مگر اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے پر قادر
نہیں۔

ان تمام تلخ تر حقیقتوں کی موجودگی کے باوجود اہل دانش کو خاموش تماشائی
ہونا زیب نہیں دیتا، لہٰذا انھیں مل بیٹھ کر سوچنے اور کچھ کرنے کی طرف دھیان دینا
چاہیے ورنہ اہل دانش پر مجرمانہ خاموشی کے چارج کو رد کرنا آسان نہ ہوگا۔

اکتوبر، ۱۹۹۵ء

# اکیسویں صدی میں ادب کے تقاضے

معاصر سہ ماہی جریدے ارتکاز کا اداریہ بعنوان "اکیسویں صدی میں ادب کے تقاضے" یارانِ نکتہ داں کے لیے صلائے عام کا درجہ رکھتا ہے۔ سو ہم نے جناب راغب شکیب کی دعوتِ فکر قبول کر کے اپنے قارئین سے رجوع کرنے کی غرض سے کچھ سخن ہائے گفتنی پیش کرنے کی ٹھانی ہے۔ اداریے کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

> "ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور یہ سوچ رہے ہیں کہ آنے والا زمانہ اپنے ساتھ کیا کچھ تبدیلیاں لا سکتا ہے اور ان تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لیے ہمیں کس طرح تیاریاں کرنے کی ضرورت ہے"۔

متوقع تبدیلیوں اور ان کے محرکات کے حوالے سے اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے:

> "اس سلسلے میں اگر ہم جنگِ عظیم دوم کے بعد کی تکنیکی پیش رفت اور سائنسی انکشافات کی تیز رفتاری پر نظر ڈالیں تو آنے والے زمانے کے خدوخال کا اندازہ بآسانی کر سکتے ہیں۔ مثلاً جنگِ عظیم دوم کے بعد سے ایٹمی توانائی پر قدرت حاصل کرنے اور

برقی و خودکار آلات کے وسیع تر استعمال نے معاشرے میں جو انقلابی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی ہے ، وہ ہمارے نظامِ اقدار کو مکمل طور پر بدل دینے کے متقاضی ہیں ۔ اگر ہم غور کریں تو دیکھیں گے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس انقلاب نے انسان کو اندر سے متاثر کر کے اس کی شخصیت کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا ہے ، البتہ انسان کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا یہ عمل مختلف ممالک میں مختلف انداز سے ظاہر ہو رہا ہے جس کا سبب مختلف ممالک کے اپنے معاشرتی حالات ہیں"۔

اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہونے کی بات کہنے کا کلی طور پر مجاز مغربی دنیا یا پھر مشرق بعید خصوصی طور پر جاپان کا کوئی شہری ہو سکتا ہے ، کیونکہ یہ ممالک صنعتی انقلاب کے مراحل طے کر کے سائنسی اور تکنیکی انقلاب (Scientific & Technical Revolution) کے سفر پر گام زن ہیں اور گزشتہ نصف صدی کے دوران ، یعنی جنگِ عظیم دوم کے بعد سے اس سفر میں کافی پیش رفت حاصل کر چکے ہیں اور وہاں کا انسان یقیناً ان تبدیلیوں کے زیرِ اثر ، جو یہ انقلاب اپنے جلو میں لایا ہے ، اپنے معاشرے کے نظامِ اقدار میں شکست و ریخت اور ممکنہ تبدیلیوں کے تجربوں سے گزر رہا ہے مگر یہ بات ہمارے معاشرے پر کہاں تک صادق آتی ہے ، میرے نزدیک محلِ نظر ہے ۔ ہم گرد و پیش پر نظر ڈالیں ، اپنے ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے انسانوں کا حال زار دیکھیں ، ان کے معیارِ زندگی اور حالاتِ کار پر نظر دوڑائیں تو ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہو گی کہ ہمارے ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے عوام بیک وقت کئی صدیوں میں رہ رہے ہیں ۔ کچھ خطے ایسے ہیں جہاں کے لوگ قرونِ وسطیٰ کے عہد میں رہ رہے ہیں اور پینے کے پانی کے حصول کے لیے روزانہ میلوں کا سفر طے کرتے ہیں اور تقریباً غار نما

مکانات میں رہتے ہیں ۔ ملک کی بیشتر دیہی آبادی کو کیا معاشرتی سہولتیں میسر ہیں ، ان سے ہم ناواقف نہیں ہیں ۔ ہمارے شہروں کی صورتِ حال بھی کس قدر حوصلہ افزا ہے ، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ۔ ملک کے سب سے بڑے شہروں لاہور اور کراچی ہی کو اپنے پیش نظر رکھیں تو اس سوال کا جواب آسان نہیں ہو گا کہ ہم وقت کی کس دہلیز پر کہاں کھڑے ہیں ۔ یہ صورتِ حال پوری تیسری دنیا کی ہے ، مگر ہم اپنی گفتگو اپنے ہی حد تک محدود رکھیں گے کہ ہمیں اپنے ادب کے حوالے سے ان تقاضوں کا جائزہ لینا ہے جو آنے والی صدی میں ظہور پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے نبرد آزما ہوں گے ۔ متذکرۂ بالا تناظر میں بات آگے بڑھائی جائے تو ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ابھی تو ہمارا معاشرہ جاگیردارانہ روایات و اقدار کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ۔ ہمارا معاشرہ تاریخی طور پر صنعتی انقلاب سے ہم کنار ہو کر سرمایہ دارانہ عہد میں داخل ہونے کی تگ و دو میں مصروفِ عمل ہے اور جاگیردارانہ باقیات اس کی راہ میں ہر ممکنہ رکاوٹیں کھڑی کر رہی ہیں ۔ سیاسی طور پر جمہوری عمل کی ناکامی اور جمہوری اداروں کی بے توقیری اس حقیقت کی منھ بولتی تصویر ہے کہ گزشتہ پانچ دہائیوں میں ہم نے جاگیردارانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے میں کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں اور سرمایہ دارانہ طرزِ ترقی سے کس حد تک شناسائی حاصل کی ہے ۔ ان حقائق کی روشنی میں جمہوری اقدار کی پاس داری ، یعنی جاگیردارانہ روایات و اقدار کی عمل داری کے سائے میں کس حد تک اور کس قدر ممکن العمل ہے ، آپ خود قیاس کریں اور تفکر فرمائیں ۔

موضوعِ گفتگو اکیسویں صدی کی آمد آمد اور ادب کے لیے نئے تقاضوں اور رویوں سے متعلق ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ وقت کی تقسیم جو ہم نے کر رکھی ہے اور جو اصطلاحات اور اعداد و شمار ہمارے پیش نظر ہیں ، وہ سب کے سب اضافی ہیں اور ہم نے تقسیم اپنی سہولت اور افہام و تفہیم کے لیے کر رکھی ہے ورنہ وقت کسی پیمانے ،

اعداد و شمار اور خانوں، اصطلاحات کا کہاں پابند ہے۔ صدی، ماہ و سال، ہفتہ و عشرہ امروز و فردا، صبح و شام اور روز و شب وقت کسی کا پابند نہیں، وہ ان پر حاوی اور ان سے بے نیاز ہے۔ جہاں صدیاں وقت کے سفر میں لمحۂ گزراں ٹھہرتی ہوں، وہاں عشروں، دہائیوں اور ماہ و سال کی کیا اہمیت ہو گی۔ بہرحال وقت کا سفر جاری و ساری ہے، اس میں کوئی تعطل و جمود نہیں ہے۔ وقت کی تو بس یہی آواز ہے کہ میں ہوں، میں ہوں، میں ہوں۔ وقت infinity اور اس کی طاقت بھی infinity ہے جس کے سامنے سب ہیچ ہیں۔ وقت کے سفر کی کچھ روداد ہم تاریخ میں محفوظ کر پاتے ہیں، ان کی مدد سے ہم تہذیب و تمدن کے خدوخال کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر تفکر کرتے ہیں۔ تاریخ وقت کے سفر کی گردِ راہ ہے اور تہذیب و تمدن وقت ہی کی دین ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ وقت کا سفر پیش رفت کا سفر ہے، ترقی کا سفر ہے، ارتقا کا سفر ہے، تبدیلیوں کا سفر ہے، غلامی سے آزادی کی سمت کا سفر ہے، زنجیروں کی شکست و ریخت کے مراحل کا سفر ہے، مراجعت اور واپسی کا سفر نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ تاریخ کے کسی "عہدِ زریں" کی واپسی کا خواب دیکھتے ہیں، وہ اصول و قانونِ ارتقا سے بے خبر خوش فہمیوں کی جنت میں رہتے ہیں جن کا حقیقت کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس تناظر میں آج کرۂ ارض پر جو بھی احیا کی تحریکیں ہیں، وہ قانونِ ارتقا سے متصادم ہیں لہٰذا ان کا انجام اور مقدر معلوم ہے۔ وہ کسی معاشرے کے پاؤں کی زنجیر بن کر اس معاشرے کی ترقی میں کچھ عرصہ حائل تو ہو سکتی ہیں مگر اس معاشرے کو ماضی کے کسی "عہدِ زریں" میں واپس نہیں لے جا سکتیں۔ ارتقا کا ہمہ گیر و ہمہ جہت سفر عظمتِ انسان کی بازیافت کا سفر ہے۔ اس سفر میں انسان غاروں سے نکل کر میدانوں اور سمندروں کو اپنا مطیع بناتے ہوئے خلاؤں میں محوِ پرواز ہے، چاند کی گرد اس کے پاؤں میں لگی ہوئی ہے اور نئی نئی دنیاؤں پر وہ کمندیں پھینک رہا ہے اور وہاں اپنے

پیغامات پہنچا رہا ہے ۔ انسانی شعور نئی نئی منزلیں اور امکانات کی نشان دہی کر رہا ہے
وقت کے ہر لمحے کے ساتھ انسان آگے بڑھ رہا ہے ، انسانی شعور آگے بڑھ رہا ہے ۔
کسی انقلاب کی ناکامی سے انسانی شعور اور انسانی تہذیب و تمدن کی پیش رفت کا
سفر جمود و سکوت کا شکار نہیں ہوتا ۔ جمود سے زیادہ ایسی صورتِ حال کو وقفہ کہا جا
سکتا ہے مگر بہت مختصر وقفہ ۔ یوں بھی انقلابات کی نوعیت تاریخ کے دریائے
بے کنار اور اس کے منھ زور دھاروں کو کسی بند کے ذریعے پابند کرنے کے مترادف
ہے ۔ یہ بند کتنی دیر تک تاریخ کے دھاروں کو اپنا پابند رکھ سکتا ہے ، اس کو سمجھنے
کے لیے انقلاباتِ عالم پر طائرانہ نظر ڈال لینا کافی ہو گا ۔

آج کی اٹل حقیقت وہ سائنسی اور تکنیکی انقلاب (S.T.R.) ہے جس نے
گزشتہ ربع صدی میں ایک اور انقلاب کو جنم دیا اور پروان چڑھایا ، وہ اطلاعات کا
انقلاب (information revolution) ہے جس نے واقعتہً کرۂ ارض کو
ایک global village میں تبدیل کر دیا ہے اور ہم آج دھرتی کے چپے چپے پر
ہونے والی تبدیلیوں اور واقعات کا مشاہدہ اسی لمحے اپنی خواب گاہ میں کر سکتے ہیں ۔
اس انقلاب کے نتیجے میں انسانی علم و شعور کی سرحدیں کس قدر وسیع تر ہو گئی ہیں ،
ان پر غور کیا جائے تو ہم خود کو عالمِ حیرت میں پائیں گے ۔ اس پس منظر اور تناظر
میں فکر و شعور اور جدید تر حسیت (ultra - modern sensibility) اور
رویوں کا ادب میں کس طرح اظہار ہو رہا ہے اور ہو گا ، اس پر غور تو کیا جا سکتا ہے
اور اس کے کچھ خدوخال کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے مگر کوئی ہدف اور دائرۂ کار
متعین نہیں کیا جا سکتا ، کوئی لائحۂ عمل اور چارٹر ترتیب نہیں دیا جا سکتا ۔ سائنسی اور
تکنیکی انقلاب اور اس کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھنے والے انقلابِ اطلاعات نے
انسانی تہذیب و تمدن کی وحدت کے ساتھ وحدتِ انسانی (oneness of
mankind) کا احساس اور شعور بھی مستحکم تر کیا ہے ۔ کوئی سانحہ کرۂ ارض پر

کہیں رونما ہو، ساری دنیا کے انسانوں کی آنکھیں بیک وقت اشک بار ہو جاتی ہیں۔ کوئی خوشی کی لہر کسی کامیابی کے نتیجے میں پیدا ہو، وہ بنی آدم کے دلوں کو بیک وقت گرما دیتی ہے، وہ کامیابی چاند پر انسان کے قدم پڑنے کی ہو یا خلاؤں کی تسخیر میں پیش رفت کی یا کسی خطے میں آزادی کے سورج طلوع ہونے کی یا کسی نیلسن منڈیلا کی رہائی کی۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی تہذیب و تمدن کا سفر کثرت سے وحدت کی سمت کا سفر ہے، اس طرح ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرہ ایک well-knit عالمی معاشرے کی تشکیل و تہذیب کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ ایک عالمی وفاق ابھر رہا ہے اور انسانی اقتصادی زندگی میں interdependence ہر ساعت بڑھ رہا ہے۔ آج دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک بھی باقی دنیا سے کٹ کر اپنا سفر ترقی جاری نہیں رکھ سکتا، یہی حال تمام شعبہ ہائے زندگی کا ہے۔ تہذیب و تمدن کے اس گہوارے میں ایک عالمی ثقافت (world culture) کی پرورش ہو رہی ہے جس کا جزوِ لاینفک ہم بھی ہوں گے، ہماری ثقافت بھی ہو گی اور ہمارا ادب بھی ہو گا۔

زیرِ نظر اداریے میں کہا گیا ہے:

"آنے والی انقلابی تبدیلیاں ہمارے نظام اقدار کو مکمل طور پر بدل دینے کی متقاضی ہوں گی، ان اقدار میں جمالیاتی اقدار بھی شامل ہیں۔ جمالیاتی اقدار میں تبدیلیاں ہمارے ادبی اسالیب اور اصناف میں بھی نمایاں تبدیلیوں پر منتج ہو سکتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا اندازہ ہم ان رجحانات سے کر سکتے ہیں جو پچھلے پچاس برسوں سے ہمارے ادب میں محسوس کیے جا رہے ہیں"۔

جس نصف صدی کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے، وہ عرصۂ وقت ہے جسے ہم بیسویں صدی کے نام سے پکارتے ہیں یعنی رواں صدی۔ اس بیسویں صدی میں جو کچھ ظہور پذیر ہوا

جو انقلابات رونما ہوئے ، جو ایجادات و دریافتیں ہوئیں اور جو ہمہ گیر و ہمہ جہت تبدیلیاں حقائق کی شکل میں سامنے آئیں ، وہ ہزاروں سالوں پر بھاری ہیں اور یہ صدی اپنی ان خصوصیات اور محرکات کے حوالے سے یقیناً سیکڑوں صدیوں پر فوقیت رکھتی ہے ۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ بیسویں صدی کی دہائیاں اور عشرے صدیوں پر بھاری ہیں ۔ ان عشروں اور دہائیوں میں انجام دیے جانے والے کارناموں (achievements) پر آج کا انسان جس قدر نازاں ہو ، کم ہے ۔ ہمارے ادب میں اس کا اظہار اور عکس جس طرح ہونا چاہیے تھا ، سو وہ ہوا ۔ تمام اصنافِ ادب میں جو کیفیتی اور کمیتی (qualitative & quantitative) تبدیلیاں آئیں ، وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور جو نئ اصناف ظہور پذیر ہوئیں ، وہ بھی ہماری تاریخ ادب کا حصہ ہیں ۔ بیسویں صدی میں عالمی منظر نامہ ہمارے ادب میں دوسری زبانوں کے ادب سے کسی طور کم تر نہیں ۔ ادب جو زندگی کا ترجمان و مفسر ہے اور زندگی کی تفہیم اور تنقید بھی جس کا منصب ٹھہرایا گیا ہے ، ہمارا ادب اس معیار اور کسوٹی پر پورا اترتا ہے ۔ قانون ارتقا کا اطلاق ادب پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح تہذیب و تمدن پر عمومی طور پر ہوتا ہے ۔ تبدیلیاں وقت کے دھارے کے ساتھ اپنا راستہ خود بناتی رہتی ہیں ۔ نئے اسالیب ، نئ لفظیات ، نئ علامتیں ، نئ تلمیحات اور تلازمے متشکل ہوتے رہتے ہیں ۔ میرے خیال میں اس کے لیے کسی منصوبہ بندی اور تیاری کی ضرورت نہیں ۔ نظام فکر اور نظام اقدار بھی قانون ارتقا کے تحت بدلتے ، سنورتے اور نکھرتے رہیں گے ۔ ادب و زندگی یک جان دو قالب ہیں زندگی سے ہٹ کر کوئی رویہ اور سوچ زندہ نہیں رہ سکتی ۔ ادب میں زندگی جس قدر بھرپور موجود ہوگی ، وہ ادب اسی قدر زندہ تر ہوگا ۔ اس کا سفرِ دوام زندگی کی جمالیاتی قدروں کو جمالیاتی پیکر دینے سے مشروط ہے ، ایسا جمالیاتی پیکر جو ناقابل فہم نہ ہو ۔ ایسا ادب پارہ جو کوئی معما اور پہیلی کا روپ دھارے ، وہ خود ادب کے زوال کا باعث

ہو گا، کیونکہ قاری سے تخلیق کا رشتہ کمزور تر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ادب اور زندگی کے تقاضے ایک دوسرے سے قریب تر ہونے کے بجائے دور تر ہوئے۔ اس ضمن میں کوئی ہیئت اور صنف ادب نہ تو مستثنیٰ ہے اور نہ خارج۔

جس طرح بیسویں صدی میں کرۂ ارض پر ہونے والی ترقی اور تبدیلی سے ہم اور ہمارا معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اس کے فیوض و برکات سے ہم اور ہمارا معاشرہ بہرہ ور ہوئے، یہ سب کچھ مستعار ہی مگر زندگی اور اس کی قدریں اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ سائنسی اور تکنیکی فتوحات اور کامرانیوں کے فیوض و برکات سے مستعار ہی ہی فیض یاب ہوں اور ان کے اثرات سے اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو بے تعلق رکھ سکیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو گویا خود کو اور اپنے معاشرے کو پس ماندگی کی تاریکی میں دیکھنا چاہیں گے جس کے اظہار کی تلقین کرنا جنھوں نے اپنا منصب اور فرض سمجھا اور روایت پرستی اور مشرقی لحن کی پاس داری کی آڑ میں تقلید اور ماضی پرستی کی وکالت کی، انھوں نے دراصل رجعت پرستی و ظلمت پرستی (obscurantism) کی تائید کی۔ یہ واضح رہے کہ زندگی کی طرح ادب میں بھی غیر سائنسی رویہ گویا خود کو وقت کے دھارے سے متصادم اور قانونِ ارتقا، جو دراصل قانونِ فطرت ہی کا دوسرا نام ہے، اسے اپنے تضادات کو جنم دینا ہے۔ قانونِ فطرت سے تضادات کی صورت میں کیا نتیجہ برآمد ہو گا، اس کا جواب وہ معاشرے ہیں جہاں اس روش پر سفر جاری ہے۔ اس کی مثال مشرقِ وسطیٰ کے وہ ممالک ہیں جہاں گزشتہ پانچ دہائیوں سے سیال سونے کی بدولت مصنوعی روشنی سے وہاں کے شہر جگمگا رہے ہیں مگر اس دھرتی سے ترقی کی کوئی کرن نہیں پھوٹ رہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ تضاد ہماری زندگی کے مسائل و مشکلات پر قابو پانے میں حائل ہے۔ ہماری درس گاہیں اس روشنی کو عام کرنے سے قاصر ہیں جس کا وقت ہم سے متقاضی ہے۔ ہمارا نظامِ فکر اور نظامِ اقدار غیر سائنسی رویوں پر استوار ہے۔

نتیجتہً ہم ترقی کی دوڑ میں کس قدر پیچھے ہیں، یہ سوال ہمارے لیے وقت کی طرف سے اہم ترین تنبیہ ہے۔ اپنے ادب کو ان تضادات سے بچائے رکھنا ہمارا سب سے اہم فریضہ بنتا ہے۔ سائنسی رویے کی ادب میں عمل داری کے لیے شعوری کوششیں کرنا گویا ان انقلابی تبدیلیوں کے لیے خود کو تیار رکھنے کی ضرورت کو محسوس کرنا ہے جو آنے والی صدی اپنے جلو میں لائے گی۔

اکیسویں صدی کا سورج ہمارے وطن کی سرزمین پر کس طرح طلوع ہوگا اور اپنی کرنوں کے ساتھ نئی زندگی اور تقاضوں کی کیا سوغات لائے گا، اس باب میں کچھ کہنا سہل نہیں۔ البتہ سائنسی اور تکنیکی انقلاب (S.T.R.) جن ممالک میں اپنا سفر گزشتہ پانچ دہائیوں سے جاری رکھے ہوئے ہے، وہاں آنے والی صدی کا سورج باقی ماندہ تاریک گوشوں کو روشن تر کرنے کا عمل شروع کرے گا۔ اس بات کی بھی توقع کی جانی چاہیے کہ اس انقلاب کی روشنی کا سیلاب اپنی لپیٹ میں ہمارے جیسے ممالک اور معاشرے کو لے لے اور ہمیں پس ماندگی اور پس ماندہ اقدارِ حیات سے نجات دلانے اور ہمیں ظلمت پرستی کے غاروں سے نکال کر روشنی کے سفر پر گامزن کرنے میں ہماری رہ نمائی کرتے تاکہ خردافروزی ہمارے ادب میں روحِ عصر کی ترجمانی کی دلیل ٹھہرے۔

مئی، ۱۹۹۵ء

# 'محک' کی مہک

ادبی تنقید اور تنقیدی ادب ، اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بہت پرانا باب نہیں ہے ، یعنی اردو ادب میں باضابطہ تنقید کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ پرانی نہیں ہے ۔ تنقید اور تخلیق یوں تو ساتھ ساتھ بہنے والے دھارے ہیں ، تخلیق کا سفر تنقیدی شعور کی رہبری کے بغیر اجالے کا نہیں بلکہ اندھیرے کا سفر ہوتا ہے ۔ تخلیق کار کا منصب سماج کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے رہنا اور سماجی زندگی کے تجربات سے دو چار رہنا ہونا چاہیے ۔ تخلیق سے روشنی کی کرنیں اس وقت پھوٹتی ہیں جب تخلیق کار کا ذہن اجالوں کا مسکن ہو ۔ غرض یہ کہ تنقیدی شعور تخلیق کی اساس کا درجہ رکھتا ہے ۔ تنقید کا دائرۂ کار تخلیق کی تفہیم سے شروع ہو کر تخلیق کے تجزیے تک پھیلا ہوا ہے ۔ تخلیق کی تفہیم و تجزیہ کے مراحل طے کرنے کے دوران تنقید ، تخلیق کار کے گردوپیش ، حالاتِ زیست اور سماج کی طرف اس کے عمومی رویوں کا بھی احاطہ کرتی ہے کیونکہ تنقید خود تنقیدِ حیات بھی ہے ۔ تخلیق اور تخلیق کار بیک وقت تنقید کا موضوع ہوتے ہیں ۔ تخلیق کو تخلیق کار سے جدا اور دور کر کے تخلیق کی تفہیم اور اس کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا میرے نزدیک جہاں ادب کو ایک

طرف dehumanise کرنے کا عمل ہے، وہاں یہ سارا عمل مکمل گمرہی ہے۔ تخلیق کار سماج میں پیدا ہوتا ہے لہذا تخلیق کار سے بے گانہ ہو کر تخلیق کا مطالعہ اور حاصلِ مطالعہ، دونوں معنویت سے محروم ہوں گے۔ ادب کے سماجی کردار کا نظرانداز کیا جانا ادب کے نصب العین اور اس کے ماضی و حال سے صرفِ نظر کرنا ہے زمان و مکان سے ماورانہ تو کسی فرد کا مطالعہ ممکن ہے اور نہ اس کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیا جانا ممکن ہے، اس کے تجربات و مشاہدات سماجی اور تاریخی تناظر میں ہی سمجھے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔

زیرِ نظر مضامین کا مجموعہ 'محک' نجمہ خان کی نثری نگارشات کا پہلا مجموعہ ہے اس مجموعے میں ایسے مضامین بھی ہیں جو تنقید کے معیارات پر پورے نہیں اترتے اور انھیں تاثراتی مضامین کا درجہ ملنا چاہیے۔ ان تاثراتی مضامین میں بھی ان کے تنقیدی زاویے اور تنقیدی رویے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ تاثراتی مضامین کی تعداد کے مقابلے میں ایسے زیادہ مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں جو تنقیدی مضامین کے تقاضوں اور معیارات پر پورے اترتے ہیں۔ نجمہ خان کی پہلی پہچان اور ادبی دنیا میں ان کی اولین شناخت ان کی شاعری رہی ہے، مگر انھوں نے اپنے شعری مجموعے کی اشاعت سے قبل زیرِ نظر نثری مضامین کا مجموعہ پیش کر کے ادبی حلقوں کے لیے ایک خوش گوار حیرت و استعجاب کا سامان بہم کیا ہے۔ اس نثری مجموعے کی پذیرائی یقینی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور جناب احمد ہمدانی جیسے صاحبانِ بصیرت و بصارت اور ناقدین فکر و فن کی سند اس کتاب کو حاصل ہے، یہ سند نجمہ خان کے ادبی مستقبل کے لیے فالِ نیک ثابت ہونا چاہیے۔

تنقید کے تقاضوں اور تنقید کی مبادیات کے حوالے سے ابتدائی سطور میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اس روشنی میں "محک" کے مضامین کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نجمہ خان کا تنقیدی شعور اور تنقیدی رویے جو ان مضامین

میں جا بجا نمایاں ہیں، وہ ادب سے ان کی گہری وابستگی کے ساتھ ساتھ ان کے وسیع تر مطالعے کے مظہر ہیں۔ اصنافِ ادب کے مطالعے کے ساتھ ان مضامین کا مطالعہ ہم عصر ادب کے مختلف مکاتیبِ فکر تک بھی ان کی رسائی کا پتا دیتا ہے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ ادب کا مطالعہ بھی کھلے ذہن سے کیا ہے اور مختلف مکاتیبِ فکر و فن کا بھی۔ انھوں نے موضوعیت کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اور معروضیت کو بھی۔ تنقیدی کی مبادیات اور تقاضوں کو انھوں نے اپنے مطالعے کے دوران مشعلِ راہ جانا ہے۔ ادب کے سماجی منصب و کردار پر وہ بہت واضح ہیں، اور ہر جگہ غیر مبہم الفاظ میں انھوں نے اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ادب کو حسن کاری جانتی ہیں اور اپنے قلم سے حسن کاری کا جادو جگانا جانتی ہیں۔ سماج میں پائی جانے والی بدصورتیوں سے وہ بے خبر نہیں ہیں جو دراصل اس معاشرتی نظام کی پیداوار ہے جس کی اساس استحصال جبر اور عدمِ مساوات پر استوار ہے۔ وہ ایک خوب صورت سماج کا خواب دیکھنے اور دکھانے کا کام ادب سے لیتی ہیں اور یہی کچھ انھوں نے ان مضامین میں، جو مختلف شخصیات اور موضوعات کے حوالے ہیں، بیان کیا ہے۔

ان مضامین میں جو شخصیات زیرِ بحث آئی ہیں اور ان کی تخلیقات اور ادبی کاوشیں زیرِ غور آئی ہیں، نجمہ خان نے ان کی تفہیم کے باب میں سماجی اور تاریخی تناظر کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اور تخلیق کار کے ذاتی تجربات کو بھی پس پشت نہیں ڈالا ہے۔ ادب کے ترقی پسند نظریے کی چھاپ ان کی آرا اور رویوں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ خاص طور پر اس مجموعے کے آخری مضمون جس کا عنوان ہے 'میرے ادبی رویے'، اس مضمون میں بڑی وضاحت کے ساتھ نجمہ خان نے اپنے ادبی نظریات پر روشنی ڈالی ہے جو تمام تر ترقی پسندانہ رجحانات کا عکاس ہے۔ مگر انھوں نے جن شخصیات کو اپنا موضوع بنایا ہے، ان میں مختلف مکاتیبِ فکر سے تعلق رکھنے والے قلم کار شامل ہیں، گویا انھوں نے خود کو کسی مخصوص دائرۂ اثر میں مقید نہیں کیا ہے بلکہ وسیع النظری

اور میانہ روی (liberalism) کو اپنا شعار بنایا ہے ۔ یہ بات ضرور ہے کہ انھوں نے جس کا بھی مطالعہ پیش کیا ہے ، ان کا زاویۂ نظر ہر جگہ موجود ہے ۔ انھوں نے کہیں بھی کسی مصلحت کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا ہے ۔ ادب اور ادبی نگارشات کو سمجھنے اور پرکھنے کے معیارات ان کے مضامین میں کہیں نہیں بدلے ہیں ۔ حسن و قبح کا معیار ان کے ہاں واضح اور دو ٹوک ہے ۔ وہ ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کو اولین اہمیت کا حامل سمجھتی ہیں اور وہ ادب پاروں کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھتی ، سمجھتی اور پرکھتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت یہی کچھ اپنے پیش نگاہ رکھتی ہیں ۔

اپنے نظریۂ ادب کے بارے میں نجمہ خان نے بڑے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تحریر کیا ہے :

" ادب کے بارے میں ، میں اس عمومی رویے سے اتفاق کرتی ہوں جو ادب اور زندگی کے ہمہ گیر رشتوں کے جمالیاتی اظہار کی ترجمانی اور نمائندگی کرتا ہے ۔ جو ادب زندگی سے بے گانگی کا علم بردار ہو اور جو لوگ ادب میں زندگی کے حقائق ، مسائل اور مصائب کے ادب میں اظہار کو غیر ادب گردانتے ہیں ، میں ان سے اتفاق نہیں کرتی ۔ میں ہر حال مین ادب کو زندگی کا ترجمان بھی سمجھتی ہوں اور زندگی کا ناقد بھی ۔ ادب ، زندگی کی حسن کاری کے عمل میں حسن کی نئ جہتیں اور رفعتیں دریافت کرتا ہے اور اس کے امکانات کی جانب قارئین ادب کی توجہ مبذول کراتا ہے ۔ زندگی کو خوب صورت دیکھنے کا خواب نصاب ادب میں شامل ہے ۔ زندگی کی تفسیر و تعبیر کرتے وقت تخلیق کار کا قلم زندگی کی بدصورتیوں کی نشان دہی کرتا ہے ۔ تخلیق ادب کو سماج سے جدا

کر کے دیکھنے والے دراصل ادب کی بے سمتی اور مہمل پن کو فروغ
دینے کی بات کرتے ہیں۔ میں کیونکہ تخلیق ادب کو ایک سماجی
ذمے داری اور فریضہ سمجھتی ہوں لہذا اپنی تحریروں کے ذریعے سماجی
زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کرتی ہوں"۔

"محک" کے مضامین سات ابواب میں منقسم ہیں۔ مجاز و حقیقت کے باب میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا واحد مضمون ہے۔ یہ گراں قدر مضمون ہے اور شاہ کی شاعری اور فن کو شاہ کے عہد کے تناظر میں سمجھنے کے ساتھ ساتھ آج کی زندگی اور سماج، اس کی معنویت کی جستجو اس مضمون میں کی گئی ہے۔ اس مضمون میں حضرت شاہ عبداللطیف کو ایک آفاقی شاعر کہا گیا ہے جو ایک غیر متنازعہ رائے ہے۔ شاہ کی شاعری کا سب سے بڑا سحر اس کی قبولیتِ عام (mass appeal) بتائی گئی ہے جس کی تائید پورا سندھی سماج کرتا ہے۔ شاہ کی شاعری کی نمایاں خصوصیت اور اثرپذیری کے حوالے سے یہ ایک مختصر مگر نہایت جامع مضمون ہے۔ نجمہ خان نے شاہ کے حوالے سے یہ مضمون لکھ کر اردو کے ادیبوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ شاہ کی شاعری کا ادراک اس سماج سے رشتے اور روابط استوار کرنے کے لیے ناگزیر ہے جو اردو کا وطن بن چکا ہے۔ سندھ کے تناظر میں سندھی اور اردو کے ادیبوں اور قلم کاروں کے درمیان افہام و تفہیم اور فکری ہم آہنگی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

روایت و درایت کے باب میں تین مضامین شامل ہیں جن میں راغب مراد آبادی اور پروفیسر وحیدہ نسیم پر لکھے گئے مضامین بنیادی طور پر تاثراتی مضامین کے زمرے میں آتے ہیں مگر بڑے جامع اور بھرپور مضامین ہیں اور مذکورہ دونوں شخصیات کے ادبی منصب کو سمجھنے کے سلسلے میں بڑی افادیت کے حامل کہے جا سکتے ہیں۔ شاعر لکھنوی پر بھی نجمہ خان کا مضمون خاصا جامع ہے اور شاعر لکھنوی کی شاعری

پر ایک اچھا مطالعہ ہے ۔ اس مضمون میں شاعر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف زیادہ اور ناقدانہ اظہار یقیناً کم ہے مگر اسے تشنۂ مطالعہ یقیناً نہیں کہا جائے گا ۔ کلاسیکی غزل کی صف میں شاعر لکھنوی کی غزل کو جو اہمیت دی گئی ہے ، وہ طرف داری کے زمرے میں نہیں آتی ۔

" طرحِ نو " کے باب میں پروفیسر منظور حسین شور ، کیفی اعظمی ، حمایت علی شاعر اور مسلم شمیم پر مضامین بڑے وقیع ہیں اور تنقیدی معیارات کی پاس داری ان مضامین میں ہر جگہ ملتی ہے ۔ کیفی اعظمی پر مضمون یقیناً بھرپور نہیں ہے اور اس کو پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کیفی اعظمی کا جو ترقی پسند ادب کی تاریخ میں مقام ہے ، یہ مضمون اس کا احاطہ نہیں کرتا ۔ کیفی اعظمی بہتر مطالعے کے حق دار ہیں ۔ " بنّے بھائی " اور " اجالوں کے خواب " ، یہ مضامین جامع تبصروں کے زمرے میں شمار ہوں گے جو ان دونوں کتابوں پر کیے گئے ہیں ، یعنی مذکورۂ بالا کتابوں کا جو مطالعہ پیش کیا گیا ہے ، وہ نہایت جامع اور تجزیاتی ہے ۔ کتابوں اور شخصیات کے علاوہ تین دیگر موضوعات پر مضامین ہیں جو نجمہ خان کے ادبی نظریات کو سمجھنے میں بہت معاون ہیں ۔ ان مضامین میں ہم عصر زندگی اور سماج پر ان کی کتنی گہری نظر ہے ، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ۔

زیرِ نظر خصوصی شمارے میں " محک " اور نجمہ خان کے حوالے سے مضامین ہیں جو متعدد اکابر ادب کے تحریر کردہ ہیں ان میں کتاب اور صاحبۂ کتاب کی پذیرائی کی گئی ہے ۔ نجمہ خان خوش قسمت ہیں کہ ان کی پہلی نثری کتاب کو اتنی اہمیت دی گئی ہے ۔ ناقدین اور نثرنگار کی یوں بھی ہمارے ہاں بڑی کمی ہے کیونکہ بہت کم لوگ نثر کی طرف توجہ دیتے ہیں ، خاص طور پر خواتین قلم کاروں نے تنقید اور نثرنگاری کی طرف بہت کم دھیان دیا ہے ۔ ممتاز شیریں کے علاوہ مستند خاتون نقاد کو اب تک تاریخِ ادب میں کوئی جگہ نہیں ملی ہے ۔ اس طرف متعدد اہلِ قلم نے توجہ کی ہے اور

نجمہ خان کو تنقید میں جگہ حاصل کرنے کی سعی مشکور جاری رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔
اردو افسانے اور شاعری میں خواتین قلم کاروں نے اب وہ منصب و مقام حاصل کر لیا ہے کہ انھیں ان اصناف میں کسی رعایتی نمبر کی ضرورت نہیں رہی ہے، خاص طور پر افسانے میں متعدد ایسے نام ہیں جن کے حوالے سے اردو افسانے کی ساکھ کو چار چاند لگے ہیں اور جو مرد افسانہ نگاروں کے ہر اعتبار سے ہم پلہ ہیں۔ تنقید کا شعبہ ابھی ایسے ناموں سے خالی ہے، مگر وہ دن دور نہیں جب خواتین ناقدین کے ایسے نام سندِ معیار حاصل کر لیں گے کیونکہ خواتین اہلِ قلم نے ماضیِ قریب میں اس طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے جن میں نجمہ خان شامل ہیں اور "محک" کی اشاعت کی صورت میں ان کو دوسروں پر برتری حاصل ہو گئی ہے۔

تنقید کا شعبہ میرے نزدیک ادب کا مشکل ترین شعبہ ہے۔ میں تخلیقی ادب کی اولیت اور توقیر کا قائل ہوں مگر میں نے تنقید کو مشکل ترین صنف گردانا ہے، کیونکہ تنقید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جس مطالعے اور بصیرت و بصارت کی ضرورت ہے، اس منزل کا حصول آسان نہیں۔ آج تنقید کی دنیا اتنی وسیع اور کثیرالجہت ہو گئی ہے کہ تمام گوشوں پر نظر رکھنا بڑے علم و فضل کے بغیر ممکن نہیں اس کے لیے مسلسل مطالعے بلکہ تمام تر مطالعے کی ضرورت ہے۔ آج ادب کا مطالعہ بغیر عالمی تناظر (global vision) کے نامکمل اور ادھورا ہو گا۔ تنقید کی سرحدیں سماج کی سرحدوں سے ملی ہوئی ہیں لہٰذا ادب کا مطالعہ سماج کے گہرے مطالعے کے بغیر ناقص و نامکمل ہو گا۔ ادب کی پرکھ ہم عصر زندگی کی ہمہ گیریت کو نظرانداز کر کے ممکن نہیں۔ نجمہ خان کا شوقِ سفر حوصلہ افزائی کا طلب گار ہے، مگر راہ میں جو نشیب و فراز ہیں، جو مراحل و مشکلات ہیں، ان کی طرف نشان دہی کرنے والوں نے اپنے منصب کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ جنھوں نے محض توصیف و مدح سرائی کی ہے، وہ تحریریں نجمہ خان کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھنا چاہییں، ایسا کرنا خوش فہمیوں کا

شکار ہو جاتا ہے ۔ خوش فہمی کے بجائے حقیقت بینی ان کے لیے بہتر رہ نمائی کا وسیلہ ثابت ہو گی ۔

" محک " کے مضامین خواہ تاثراتی ہوں یا تنقیدی ، ان کا ابلاغ بہت واضح ہے ۔ نجمہ خان کا اسلوب اور اظہار ان کی شخصیت کی طرح نہایت دل کش و دل نشین ہے ۔ ان کے مضامین کی ایک خصوصیت حسن زبان و بیاں ہے ، زبان خوب صورت و سلیس ہے اور ان مضامین کو پڑھتے وقت قاری کو کوئی الجھن درپیش نہیں ہوتی اور نہ کسی confusion کا احساس ہوتا ہے ۔ زبان کی سلاست کا سرچشمہ قلم کار کی ذہنی کیفیت ہوتا ہے ۔ اگر قلم کار جس موضوع پر لکھ رہا ہے ، وہ موضوع اس پر واضح اور منکشف ہے اور موضوع پر اسے پوری پوری گرفت حاصل ہے تو تحریر میں کسی الجھن اور confusion کا خدشہ نہیں ہوتا ۔ اگر قلم کار موضوع پر گرفت نہیں رکھتا تو اس کی تحریر میں ابہام اور confusion کا در آنا ناگزیر ہے ۔ نجمہ خان کے مضامین اس خامی اور کمزوری سے مبرا ہیں ۔ وہ جو کچھ چاہتی ہیں ، سوچتی ہیں اور اپنے قاری تک پہنچانا چاہتی ہیں ، وہ بڑی کامیابی کے ساتھ یہ فریضہ انجام دیتی ہیں ۔ یہ مضامین ان کے ہاں پائے جانے والے clarity of thoughts کے آئینہ دار ہیں ۔ وہ واضح فکر اور رائے کا اظہار کرنے میں نہ تو کوئی دقت محسوس کرتی ہیں اور نہ جھجک ۔ ان مضامین میں شخصیات اور موضوعات ، دونوں باب میں وہ یکساں دو ٹوک رائے رکھتی ہیں جس کا اظہار کرنے میں انھوں نے کوئی الجھن محسوس نہیں کی تبصرہ و تنقید کی زبان اگر خوب صورت اور سلیس ہو تو یہ قلم کار کی اضافی خوبی کہلائے گی اور تحریر کا اضافی حسن کہلائے گا ۔ " محک " میں یہ اضافی حسن کہیں ماند نہیں پڑا ہے ۔

۰ ررچ ، ١٩٩٩ء

# شخصیات

# یگانہ چنگیزی

خودی کا نشہ چڑھا ، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

(۱۸۸۲ - ۱۹۵۶ء)

یگانہ چنگیزی بلاشبہ ایک یگانۂ روزگار تخلیق کار تھے۔ غزل ان کی محبوب صنف سخن ثابت ہوئی اور اس صنف میں ان کے تمام ترجوہر نمایاں ہوئے۔ ان کی شاعرانہ زندگی کم و بیش نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز کو ان کی شعری سفر کا نقطۂ آغاز بھی کہا جا سکتا ہے جو غزل کی تاریخ کے دور میں اس کے زوال کا دور تھا، کیونکہ جدید اردو شاعری کے آغاز سے صنف غزل کو ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا اور حالی نے یہ کہہ کر کہ

اب گئے ، حالی ! غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی گاتے ہو کیا

غزل کی طرف سے عام بے زاری پیدا کر دی تھی۔ سرسید تحریک نے ادب کے ہر گوشے کو متاثر کیا جس سے ادب اور زندگی میں گہرے روابط استوار ہوئے لیکن غزل

سے بے اعتنائی میں اضافہ ہوا اور لوگ غزل سے دور ہونے لگے۔ ادب کے افق پر علامہ اقبال اور جوش جیسے بنیادی طور پر نظم گو شعرا مہرِ نیم روز کی طرح درخشاں تھے۔ ان حالات میں جن شعرا نے غزل کی سچائی کو اپنا نصب العین بنایا، ان میں یگانہ کا نام بہت روشن ہے۔

یگانہ کے علاوہ غزل کی نشاۃِ ثانیہ جن سے موسوم ہے، ان میں حسرت موہانی (۱۸۷۵ - ۱۹۶۰ء)، فانی بدایونی (۱۸۷۹ - ۱۹۴۱ء)، اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ - ۱۹۳۶ء)، جگر مراد آبادی (۱۸۹۰ - ۱۹۶۰ء) اور فراق گورکھپوری (۱۸۹۶ - ۱۹۸۲ء) کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اس قبیلۂ خاص میں یگانہ سب سے مختلف بھی نظر آتے ہیں اور سب سے منفرد بھی:

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

انیس نے اردو نثر کی بالادستی کے پس منظر میں شاعری کے بارے میں یہ بات کہی تھی، مگر نظم کے تناظر میں غزل کے حوالے سے یہ بات یگانہ سے منسوب کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور مرزا واجد حسین یاس لکھنوی، جو بعد میں یگانہ چنگیزی بن گئے، اپنے مولد و مسکن عظیم آباد (پٹنہ) سے کچھ اس طرح نکلے کہ ہمیشہ کے لیے ان کے حوالے بدل گئے۔ ان دونوں اکابرِ ادب کے ترکِ وطن کی نسبت یہ شعر بڑا برمحل ہے:

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

یگانہ کو ارضِ لکھنؤ میں اپنے لیے جگہ بنانے میں بڑے کڑے مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ ایسی مشکلات تھیں جن سے مرزا اسد اللہ خاں غالب کو دوچار ہونا پڑا تھا جب وہ

اکبرآباد سے دہلی منتقل ہوئے تھے۔ اس وقت کے اساتذۂ دہلی نے غالب کا جس سرد مہری سے استقبال کیا تھا، کم و بیش وہی صورتِ حال یگانہ کو لکھنؤ میں پیش آئی بلکہ اس سے کہیں شدید مخالفتوں اور معرکہ آرائیوں سے واسطہ پڑا۔ ان مخالفتوں اور معرکہ آرائیوں کا بڑا سبب خود یگانہ کی سرشت میں شامل مبارزت طلبی کا عنصر تھا۔ لکھنؤ میں قیام پذیر ہونے کے آغاز ہی سے ادبی حلقوں میں لکھنؤ میں صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی اور عزیز لکھنوی سے ان کی خاصی ٹھنی اور دیگر اربابِ قلم سے بھی وہ چونکھی معرکہ آرائی کرتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'نشترِیاس' شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے فوراً بعد یگانہ اور شعرائے لکھنؤ میں ادبی معرکہ آرائی تقریباً جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے کم و بیش سال بھر بعد انھوں نے علم عروض پر اپنا مشہور رسالہ چراغِ سخن شائع کیا۔ اس رسالے میں بحور و قوافی سے بحث کے بجائے صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی اور عزیز لکھنوی کے کلام کی تقطیع کی گئی تھی۔ اپنے ان ہم عصر شعرا کے کلام سے بحث کرتے وقت ان کا انداز سخت تنقیصی تھا۔ پھر اس لپیٹ میں غالب، اقبال، جوش، حسرت اور جگر بھی آگئے۔ غالب شکنی تو یگانہ کی سب سے بڑی کمزوری ثابت ہوئی۔ غالب شکنی کا خبط سوار نہ ہوتا اور یگانہ اپنی توانائیاں تخلیقی نگارشات پر مرکوز کرتے تو اردو ادب کو یقیناً ایک بہت بڑا یگانہ میسر آتا اور اردو کا شعری ورثہ کہیں زیادہ وقیع ہوتا۔

شاعری شخصیت کا منھ بولتا روپ ہے۔ شاعری کی یہ مختصر ترین تعریف یگانہ پر حرف بحرف صادق آتی ہے۔ یگانہ بہت کھرے آدمی تھے۔ مفاہمت، عاقبت اندیشی اور صلح جوئی انھیں چھو کر نہیں گئی تھی۔ وہ خود پرستی اور انا پرستی کا نمونہ تھے۔ آیاتِ وجدانی کے دوسرے اڈیشن کا انتساب جلالت مآب چنگیز خاں کے نام ہے، اور یہ کہنا درست نہیں کہ یاس لکھنوی سے یگانہ چنگیزی تک پہنچانے میں خود پرستی، انا پرستی اور انفرادیت کی نمائش کا جذبہ کار فرما تھا۔ ان کی برخود غلط انا کا کوئی جواز تلاش

نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے یہ الفاظ کہ "ہندوستان کی ادبی دنیا میں بیسویں صدی کا سخن ور علی الاطلاق تنہا شاعر، آرٹسٹ اور جینیس مرزا یگانہ کے سوا کوئی دوسرا ٹھہر نہیں سکتا"، خودستائی کی یہ منزل تعلی کی تمام حدود کو پس پشت چھوڑ جاتی ہے۔ بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین، یگانہ کی یہ کھری اور مصلحت ناشناس شخصیت ایک دم سے نہیں بلکہ رفتہ رفتہ تلخی اور تندی کی طرف بڑھی ہے۔ حق گوئی کی شمع کی روشنی اندھیرے کو دور نہیں کر سکتی، اس کی روشنی میں وہ صرف خود کو دیکھ سکتے ہیں، چنانچہ ان کی نظر اپنی شخصیت پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اپنی خودداری اور خود اعتمادی کو زمانے کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لیے انھیں شدید جدوجہد کرنا پڑی۔ اس جدوجہد کی تلخی نے انھیں خود پرستی اور خودستائی کی راہ پر ڈال دیا۔ وہ ماحول سے صلح نہیں کر سکتے تھے، ماحول ان سے صلح نہیں کر سکتا تھا، نتیجہ ایک طویل معرکہ آرائی تھی جس سے ان کی شخصیت اور ان کی غزل، دونوں تشکیل پاتی ہیں۔

یگانہ، نہ عملی سیاست کے قائل تھے نہ نظریاتی سیاست کے۔ کسی مخصوص اور مربوط نظامِ زندگی کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ داخلی انفرادیت اور انانیت کے سبب یگانہ کی طرزِ فکر ان خطوط پر استوار ہوئی جس نے انھیں کسی مخصوص سماجی یا سیاسی نظام سے دور رکھا اور وہ اپنے زمانے کی سب بڑی تحریک، تحریکِ آزادی سے کٹ گئے جس سے پورا برِ صغیر قوت پا رہا تھا۔ اس کے علاوہ پہلی جنگِ عظیم، دوسری جنگِ عظیم اور انقلابِ اکتوبر ایسے تاریخ ساز واقعات کے اثرات سے بھی ان کا کلام خالی ہے۔ بہر کیف یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اپنے عکسِ ذات کے علاوہ کچھ نہ دیکھ سکنے کے باوصف وہ اردو کے عظیم غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے دبستانِ لکھنؤ میں آتش کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کا کلاسیکی اسلوب انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے کلاسیکی شاعر تھے۔

اردو غزل کی تاریخ میں یگانہ ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جنھیں نظر انداز کر کے غزل کے ارتقا کی صحیح تصویر کشی نہیں کی جاسکتی۔

اپریل، ۱۹۹۰ء

# علامہ جمیل مظہری

بیسویں صدی تحریکات، انقلابات اور ایجادات کی صدی ہے۔ اس صدی میں انسان نے جتنی نیرنگی، جتنا تنوع اور جتنے تضادات دیکھے ہیں، وہ اس سے پہلے انسانی تاریخ نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ادب چونکہ کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی سطح پر ایک انسانی دستاویز اور کائنات کا آئینہ ہوتا ہے، اس لیے رواں صدی کے ادب میں اس صدی کے تمام حالات و واقعات، فتوحات و ناکامیاں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اس صدی کا نصف اول حصہ، آزادی کی جدوجہد سے معمور تھا۔ پھر اس جدوجہد کے نتیجے میں آزادی آئی اور برصغیر کے ممالک اس صدی کے نصف دوم حصے میں آزادی کے بعد دوسرے مرحلے میں داخل ہو گئے، تعمیر و تخریب اور یگانگت و بے گانگی کی نئی صورتیں سامنے آنے لگیں۔

برصغیر کے ادبیات، خصوصاً اردو ادب پر اس صدی کے عالمی افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ یہاں کے اپنے تلخ و شیریں حالات کا عکس بہت گہرا اور بہت واضح نظر آتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ رواں صدی کی اردو شاعری کو جن ناموں نے متاثر اور اسے نئی جہتوں اور نئی رفعتوں سے آشنا کیا، ان میں سرفہرست علامہ اقبال کا نام ہے۔ ان

کے بعد جوش، حفیظ، حسرت، یگانہ، فراق، راشد اور فیض کے نام خصوصی اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ انھی ناموں میں ایک نام علامہ جمیل مظہری کا بھی شامل ہے اس فرق کے ساتھ کہ آخرالذکر کو اپنے دوسرے ہم عصروں کے مقابلے میں شہرت ذرا بعد میں ملی اور نقادوں نے ان کے فکر و فن کی طرف کچھ دیر میں توجہ کی۔

علامہ جمیل مظہری، جن کا اصل نام سید کاظم علی کاظمی تھا، ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ۱۹۸۰ء میں وفات پائی۔ عمرِ طبعی کے ان ۷۶ اور تصنیف و تالیف کے تقریباً ۵۵ برسوں کے درمیان انھوں نے علم و آگہی، زبان و تہذیب، ادب و صحافت اور سیاست و انسانیت کی جو خدمت انجام دی، وہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش اور لائق افتخار و تقلید باب ہے۔ اس ضمن میں خاص بات یہ ہے کہ جمیل مظہری نے جو بھی خدمات یا کارنامے انجام دیے، وہ خاموشی اور بے نیازی کے ساتھ انجام دیے۔ عملی سیاست سے وابستہ رہنے کے باوجود وہ خود کو کبھی پبلک فیگر یا سلیبریٹی بنانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا رویہ اپنی عام زندگی اور ادب، دونوں ہی میں صوفیوں اور سنتوں کا رویہ تھا۔

علامہ جمیل مظہری اس صدی کے اہل حرف میں دو باتوں کی بنا پر خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اول یہ کہ اپنا ایک مخصوص مزاج اور اسلوب رکھنے کے باوجود ان کے ہاں جو بوقلمونی نظر آتی ہے، وہ کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتی۔ شاعری میں نظم، غزل، مرثیہ، سلام، مسدس سے گیت تک اور نثر میں افسانہ، ناول تنقید سے فکاہیہ کالم نگاری تک انھوں نے جس تخلیقی اپج اور تازگی و توانائی کا ثبوت دیا ہے، اس پر ادب کے طالب علم کو حیرت ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ اردو شاعری کی فکری سطح کو بلند کرنے میں انھوں نے علامہ اقبال کے بعد سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو کے اس جلیل القدر شاعر و ادیب کی گیارھویں برسی کے موقع پر ان کے فکر و فن کا جائزہ لینے کے لیے حلقۂ فکر و نظر اور ادارۂ طلوعِ افکار نے ایک سیمینار کا اہتمام

کیا جس میں بلدیہ، کراچی وسطی کا تعاون بھی شامل تھا ۔ اس سیمینار میں محترمہ شاہدہ حسن ، جناب مسلم شمیم ، جناب احمد ہمدانی ، حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے مہمان جناب پروفیسر سید سراج الدین ، مہمان خصوصی اور سندھ اسمبلی کے اسپیکر جناب عبدالرزاق خاں اور صاحب صدر جناب پروفیسر ممتاز حسین صاحب نے جمیل مظہری کی ادبی خدمات کا محاکمہ پیش کیا جبکہ تعارف اور نظامت کے فرائض جناب علی حیدر ملک نے انجام دیے ۔ روشن بدایونی نے مرحوم شاعر کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ۔ اس کے باوجود اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ سیمینار کی اپنی محدودات کے باعث جمیل مظہری کی شخصیت اور فکر و فن کے کئی پہلو توجہ سے محروم یا تشنہ رہ گئے، لیکن یہ بات یقیناً قابل اطمینان ہے کہ اس طرح حق دار کو اس کا حق دینے کی روایت کو تقویت ضرور حاصل ہوئی ۔

اگست ١٩٩٩ء

# پرویز شاہدی

زیرِ نظر شمارے کا خصوصی گوشہ ایک ایسے شاعر سے منسوب ہے جس کے لیے ادب کوئی مشغلہ، جزوقتی شغل یا تفننِ طبع کا سامان نہیں تھا بلکہ اس کے لیے شعر و ادب ایک مشن اور مسلک تھا۔ فکر و فن اس کی زندگی کا جزوِلاینفک کی حیثیت رکھتا تھا، کیونکہ وہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کا قائل تھا اور شعرگوئی کے ذریعے وہ اپنے آدرش کی روشنی دوسروں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے معاشرے اور گردوپیش پر محیط مصائب و آلام، جن سے خلقِ خدا کی بھاری اکثریت دوچار تھی، کے خاتمے کا خواب دیکھتا تھا اور وہ خواب اپنے شعروں کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس آدرش سے اپنی وابستگی، یعنی کمٹمنٹ (commitment) کی خاطر اس نے اپنے فیوڈل پس منظر کو خیرباد کہا اور اپنی آبائی حویلی سے نکل کر کلکتے پہنچا اور عام لوگوں کی سی زندگی اپنائی اور عام لوگوں کے دکھوں سکھوں سے آشنائی پیدا کی اور انھیں اپنی تخلیقات کی زینت بنایا۔ اس نے ترقی پسندیت کے دھارے میں شامل ہونا اس لیے پسند نہیں کیا کہ اس وقت کا فیشن تھا، بلکہ ترقی پسندیت اس کے رگ و پے میں اس کے گہرے شعور کی وساطت سے اتری۔ اس کا سماجی شعور اس کے انسان دوست ضمیر سے ابھرا تھا۔

اس کا سماجی شعور معاشرے کے معاشی، سیاسی اور اخلاقی ڈھانچے میں ایسی بنیادی تبدیلیوں کا طالب تھا جن کے نتیجے میں وہ زنجیریں پاش پاش ہو جائیں جو انسانوں کی بھاری اکثریت کی آزادی کی قاتل ہیں۔ وہ بھوک افلاس اور احتیاج کو روحِ انسانی اور ضمیر کی آواز کے لیے زہر ہلاہل جانتا تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے قیام کا خواہاں تھا جہاں انسان ضمیر فروشی، عصمت فروشی اور روح کشی کے لیے مجبور نہ ہو۔ اسے اپنے آدرش پر کامل یقین تھا اور انسانی شعور کے سفر کی پیش رفت اور ہمیشہ ارتقا پذیر ہونے پر پورا بھروسا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے جاری و ساری رہنے اور اسے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر پر اس کا ایمان تھا:

ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حدِ نظر سے آگے بھی
راہ گزر ہی راہ گزر ہے راہ گزر سے آگے بھی

پرویز شاہدی (۱۹۱۰ - ۱۹۶۸ء) انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے کسی گم نام سپاہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اس تحریک کے ہراول دستے کے ایک اہم رکن اور ممتاز شاعر تھے۔ یگانہ چنگیزی نے اپنے مولد و مسکن عظیم آباد (پٹنہ) سے ہجرت کر کے ہمیشہ کے لیے لکھنؤ کو اپنا لیا اور مرزا واجد حسین یاس لکھنوی اور بعد ازاں یگانہ چنگیزی بن گئے۔ کم و بیش یہی کچھ بات پرویز شاہدی کے حوالے سے کی جا سکتی ہے کہ وہ بھی اپنی جنم بھومی عظیم آباد سے ترکِ سکونت کر کے اپنے عنفوانِ شباب، یعنی ۱۹۳۵ء میں کلکتے کے ہو رہے مگر اپنے تخلص کے ساتھ کلکتوی کا لاحقہ نہیں لگایا۔ پرویز شاہدی نے بڑی عمر نہیں پائی، لہٰذا ان کی شعری زندگی بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، وہ ربع صدی پر محیط رہی ہوگی، مگر ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں ہوا اور چالیس کی دہائی میں ترقی پسند شعر و ادب کا غلغلہ تھا۔ جن آوازوں سے فضائے ادب گونج رہی تھی، ان میں ایک منفرد نہیں تو موثر آواز پرویز شاہدی کی بھی تھی۔ ترقی پسند شعرا کی جو کہکشاں آسمانِ ادب پر ابھری تھی، پرویز شاہدی اس کہکشاں کے ایک تابندہ

ستارہ تھے، اور برصغیر کے مشرقی خطے یعنی بہار، بنگال اور مشرقی یو۔پی میں دو عشروں تک پرویز شاہدی کی شاعری کا سحر ادبی حلقوں میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔

پرویز شاہدی کمٹمنٹ کے شاعر تھے اور کمٹمنٹ کی خاطر اپنی سرگرمیاں صرف تخلیقی میدان تک محدود نہیں رکھیں بلکہ اپنے آدرش کے لیے ہمہ تن جدوجہد بن گئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، کلکتہ کے عرصۂ دراز تک صدر اور روح رواں رہے اور اس فورم سے اپنی وابستگی کی معنویت فزوں تر کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جس کی ایک آدرش اور نظریے سے وابستگی متقاضی ہوتی ہے۔ پرویز شاہدی نے اپنے رہبر سجاد ظہیر کی طرح اپنے موروثی مفادات کو ترک اور تج کر کے انسانی عظمت کے حصول اور معاشرے کو جبر و استحصال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدصورتیوں سے نجات دلانے کے لیے سنت کرتم کی پیروی کی اور وہ ساری عمر اپنے آدرش کی صلیب پر سجے رہے۔ مرحوم نے کسی موڑ پر نہ تو اپنی تخلیقی نگارشات پر اور نہ اپنی زندگی میں کسی پچھتاوے کا اظہار کیا اور قنوطیت سے رسم و راہ پیدا کی۔ وہ ناسازگار حالات میں دکھی ضرور ہوئے، مگر نہ تو انھوں نے وضع داری سے روگردانی کی اور نہ اپنے آدرش اور نظریے سے منھ موڑنے کی روش اپنائی۔ وہ سراپا خلوص تھے اور یہ خلوص ان کی شخصیت اور فن، دونوں میں یکساں نمایاں ہے۔

ادارۂ طلوعِ افکار نے یہ وسیع تر گوشہ مخصوص کر کے مرحوم پرویز شاہدی کو خراج تحسین پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ جن کے نزدیک ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کے بیدار ضمیر کی صدائے بازگشت کی حیثیت رکھتی تھی، وہ سچائی کو حسن اور حسن کی سچائی جانتے تھے اور پنی نگارشات کو اس فکر سے منور رکھتے رہے۔ ادب ان کے لیے تعمیرِ حیات کا وسیلہ اور انسان کے لیے نجات کا راستہ تلاش کرنے کا عمل تھا۔ وہ روح عصر کی ترجمانی کو ادب کی قدرِ اول جانتے تھے، اور روح عصر ان کے نزدیک جبر و استحصال سے معاشرے کو پاک کرنے کی طلب گار تھی۔ دسمبر، ۱۹۹۱ء

# غلام ربانی تاباں

وہ مر گیا ہے تو اک دور مر گیا، تاباں!
زمانۂ شوق کی اک یادگار تھا، نہ رہا

جناب غلام ربانی تاباں کی وفات کی خبر سے اپنے اور دنیائے ادب کے غریب تر ہونے کا احساس فزوں تر ہو گیا ہے۔ مندرجۂ بالا شعر تاباں صاحب کی ایک نظم "نذرِ ڈاکٹر ذاکر حسین" کا آخری شعر ہے جو آج خود تاباں صاحب کی موت کے بعد حسبِ حال ہو گیا ہے۔ اس نظم کے دو شعر اور نذرِ قارئین ہیں:

کسے خبر ہے گل یاسمیں پہ کیا گزری
کہ ایک رمز شناسِ بہار تھا، نہ رہا
ہے یوں کہ قطرۂ شبنم کی طرح پاکیزہ
ابھی یہیں وہ درِ شاہوار تھا، نہ رہا

تاباں صاحب صورتاً و سیرتاً ہر دو اعتبار سے پاکیزہ کہلانے کے مستحق تھے اور وہ ایک ایسا رمز شناسِ بہار تھا کہ آج اس کے لیے واقعی چمنِ شعر اداس ہے۔ ان کی

شاعری میں ان کی شخصیت کی پاکیزگی ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے اور ان کی غزلوں کی غنائیت اور لہجے کی نغمگی ان کے رمز شناسِ بہار ہونے کی دلالت کرتی ہے۔

تاباں صاحب ۱۵ فروری، ۱۹۱۴ء کو یو۔ پی کے مشہور شہر فرخ آباد میں پیدا ہوئے اور ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ۱۹۴۱ء میں ہوا۔ ۱۹۱۴ء وہ سال ہے جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تھی اور ملک میں جنگِ آزادی کا بھی بڑا زور تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خون آشام سانحہ تحریکِ آزادی کے متوالوں کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوا تھا۔ آزادی کی تحریک کے اس موڑ پر خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کی ابتدا اور انتہا یہ وہ قومی اور بین الاقوامی منظر نامہ تھا جس ماحول اور فضا میں تاباں صاحب نے آنکھ کھولی اور ان کی فکری تربیت شروع ہوئی۔ شاعرانہ زندگی کے آغاز کے وقت وہ پختہ شعور اور پختہ ذہن کے مالک تھے، چنانچہ آزادی کی تحریک سے ذہنی طور پر غیر متعلق رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک چند برسوں میں برصغیر کے ادبی افق پر مہر نیم روز بن کر اپنی روشنی سے گوشہ گوشہ منور کر رہی تھی، چنانچہ تاباں کی زندگی میں ان عوامل کی کار فرمائی شامل ہو گئی۔ انسانیت دوستی کے سر چشمے قومی آزادی کے سوتوں سے جا ملے اور وہ دامے، درمے، سخنے اور اپنے آدرش کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ نظریاتی طور پر وہ مارکسی نظریات سے قریب تر ہوتے گئے۔ ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں یہ سارے مظاہر کار فرما دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسے دانش ور اور اہل قلم کے طور پر جانے پہچانے گئے جن کی زندگی میں تضادات کی نشان دہی کرنا مشکل کام ہے۔ جس آدرش کو انھوں نے اپنی فکر و شاعری کا محور بنایا، اس کے لیے انھوں نے بھرپور عملی سرگرمی کا بھی مظاہرہ کیا اور اس راہ میں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے اور سرخرو رہے۔

تاباں صاحب نے اپنے شعری مجموعے 'غبارِ منزل'، مطبوعہ ۱۹۹۰ء کے دیباچے کے آغاز میں تحریر کیا تھا: "ستر (۷۰) سال کے طویل عرصے میں کیا کھویا اور کیا

پایا کی تفصیل میں جائے بغیر صرف اتنا عرض کروں گا کہ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔ راستے میں نشیب بھی تھے اور فراز بھی، چمن زار بھی تھے اور خار زار بھی، بستیاں بھی تھیں اور ویرانے بھی۔ میں نے انھیں زندگی کے حصے میں سمجھا۔ زندگی سے پیار کرتا ہوں۔ اس کا ہر روپ مجھے عزیز ہے"۔ اپنی ستر (۷۰) سالہ زندگی پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد جس اطمینان اور ایقان کا مرحوم نے اظہار کیا، وہ اظہار کس قدر پر اعتماد ہے! زندگی سے اپنی والہانہ محبت کو جن لفظوں میں بیان کیا ہے، ان لفظوں کا خلوص قابل قدر ہے۔

تاباں صاحب اپنے آدرش کے ساتھ اپنے آخری سانس تک زندہ رہے۔ گزشتہ عشرے میں وہ ترقی پسند تحریک کے احیا کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہے اور نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرز کی مجلس عاملہ کے عرصۂ دراز تک چیرمین رہے۔ ان کی قیادت میں ترقی پسند تحریک ماضی میں نمایاں طور پر فعال رہی۔ ۱۹۸۴ء میں لکھنؤ میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی سے پہلے اور بعد میں اہم ترین کانفرنسیں منعقد ہوئیں، ان سے پورے انہماک کے ساتھ وابستہ رہے۔ آدرش اور تحریک کے ساتھ غیر معمولی وابستگی کے باوصف ان کی تخلیقی زندگی خاصی متاثر رہی اور خاص طور پر گزشتہ پندرہ، سولہ برسوں میں ان کی تخلیقات بہت کم سامنے آئیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے "غبارِ منزل" کے دیباچے میں خود لکھا کہ "میں یوں بھی کبھی زود گو نہیں تھا۔ "نوائے آوارہ" کی اشاعت کے بعد ایک موضوعی صحافت میں دلچسپی لینے لگا۔ فرقہ پرستی اور انتشار پسندی کے خلاف جدوجہد کے لیے میں نے اپنا قلم وقف کردیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر تخلیقی عمل پر بھی پڑا۔ ۱۹۷۶ء کے بعد مشکل سے سال میں دو غزلوں کا اوسط رہا"۔

تاباں صاحب ہرچند کہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع سے وابستہ رہے، مگر وہ کبھی انتہا پسندی اور شدت پسندی کے قریب نہیں پھٹکے۔ ان کی شعری زندگی

اور سیاسی زندگی، دونوں یکساں طور پر بڑی متوازن رہیں۔ ان کی صنفِ غزل سے وابستگی اور ان کی غزلوں کی فضا اور ان میں پائی جانے والی غنائیت اور نرم و گداز لہجہ ان کی متوازن فکر اور شخصیت پر دال ہے۔

تاباں صاحب ترقی پسند تحریک کی باقیات الصالحات میں سے تھے۔ ان کی وفات سے واقعی ایک خلا کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ وہ ان میں سے تھے جنھوں نے اپنی ذات کے بجائے تحریک اور آدرش کو فوقیت اور ترجیح دی اور ذاتی شہرت کی خاطر کبھی کسی مصلحت اور موقع پرستی کے شکار نہ ہوئے۔ وہ سراپا خلوص تھے، سراپا یقین تھے اور انسانیت دوستی ان کی شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ ان میں سے تھے جنھوں نے اپنے جاگیردارانہ اثاثوں کو اپنے آدرش پر قربان کر دیا اور اپنے دیگر ترقی پسند ساتھیوں کی طرح، گوتم بدھ کی طرح سب کچھ تیاگ کر انسانی عظمت اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ محبت ان کی شاعری کی اساس ہے۔ اور یہ محبت ان کے یہاں فنی جمالیات کے ساتھ ایک بحرِ بے کراں کی صورت میں نظر آتی ہے۔ "غبارِ منزل" کے انتساب کے یہ الفاظ: "انسان کے روشن مستقبل کے نام جسے میں نہ سہی، میرے بعد آنے والی نسلیں ضرور دیکھیں گی"، ان کی پوری فکری اور تخلیقی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے نہ ہونے کا صدمہ اس یقین کے اظہار سے کم ہو جاتا ہے جو انھوں نے انسانیت کے روشن مستقبل کے حوالے سے کیا ہے۔ بہر حال:

پھول رنجیدہ، صبا غمگین، چمن افسردہ ہے
آج تاباں انجمن کی انجمن افسردہ ہے

ادارۂ طلوعِ افکار تاباں صاحب کے اہلِ خاندان کے دکھوں میں برابر کا شریک ہے اور ادبی دنیا کو ان کی وفات سے جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے، ادارے کو اس کا شدید احساس ہے۔ ادارۂ طلوعِ افکار مستقبل قریب میں ایک جامع گوشہ نذرِ تاباں کرے گا۔

جنوری، ۱۹۹۳ء

# پروفیسر ممتاز حسین

جان کر منجملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے
(جگر)

پروفیسر ممتاز حسین مرحوم یقیناً ان چند خاصانِ مے خانہ میں سے تھے جن کے لیے جام و پیمانہ مدتوں اشک بار رہیں گے۔ فضائے مے کدہ سوگوار رہے گی بلکہ نظامِ مے خانہ ایک عرصۂ دراز تک متاثر رہے گا۔ مرحوم کا شمار ان شخصیات میں ہو گا جن کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہوتا ہے جس کے پُر ہونے میں زمانہ صرف ہوتا ہے۔ ان کی موت سے دنیائے اردو ادب غریب تر ہو گئی ہے۔ اردو تنقید کا وہ اس وقت اہم ترین نام تھے۔ ان کی رحلت سے دنیائے تنقید کا گویا درخشاں ترین سیارہ غروب ہو گیا۔ وہ کم یاب نہیں بلکہ نایاب صاحبانِ کمال میں سے تھے۔ بقول شاد عظیم آبادی:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

مرحوم اپنی زندگی ہی میں اردو تنقید کی تاریخ میں ایک اہم باب کا منصب پا چکے تھے

اور اب وقت کے ساتھ ان کی حیثیتِ اعتراف (acknowledgement) میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

پروفیسر مرحوم کی ادبی زندگی کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ انھوں نے یوں تو ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نویسی سے کیا اور صحافتی مضامین بھی لکھے، مگر ان کی محبوب صنف تنقید تھی، یہی شعبۂ ادب ان کی پہچان رہا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پروفیسر ممتاز حسین اردو کے نقاد تھے جنھوں نے ادبی تنقید کو سائنسی مزاج اور فلسفیانہ کردار عطا کیا۔ ان کے ادبی شعور کی تعمیر و تربیت ایک ایسے عہد میں ہوئی جب نہ صرف جنوبی ایشیا میں بلکہ عالمی ادب اور دانش و حکمت میں کارل مارکس کے انقلابی نظریات اور جدلیاتی افکار کے گہرے اثرات مرتسم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی رائے میں اختر حسین رائے پوری اور سید احتشام حسین کے بعد اردو تنقید کو مارکسی طریق فکر سے آشنا کرنے کا کام پروفیسر ممتاز حسین نے انجام دیا، لیکن ادب کے مطالعے میں جس مارکسی نقطۂ نظر سے انھوں نے کام لیا، اس کی تشکیل میں عہدِ جدید کے علم و آگہی کے دوسرے ماخذ بھی رہے ہیں، یعنی ادب کی تفہیم و تعبیر میں انھوں نے صرف مارکسی نقطۂ نظر کا اطلاق میکانکی یا ادعائی ڈھنگ سے نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے ایک لچک دار، متوازن اور تخلیقی رویہ اختیار کیا جو قاری کو ہمہ جہت بصیرت دیتا ہے۔ ان کی ادبی تنقید ایسا فلسفیانہ عمل ہے جس میں منطقی استدلال، سماجیاتی تجزیے اور سائنسی معروضیت، تینوں کا عمل دخل ہوتا ہے اور اس لیے نتائج کے اعتبار سے ان کی تنقید اپنے معاصرین سے مختلف ہی نہیں، معقول، مدلل اور متوازن بھی ہوتی ہے جو قاریٔ ادب کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی استعداد بخشتی ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین کی تنقیدی بصیرت اور ان کی انفرادیت کے حوالے سے ڈاکٹر قمر رئیس کی رائے سے سرِ مو اختلاف ناممکن نہیں۔ مرحوم کا ان مشاہیر میں

شمار ہوتا ہے جن سے ان کے معاصرین اختلافِ رائے تو کر سکتے ہیں ، ان کی بلند منصبی کے منکر نہیں ہو سکتے ۔ ادبی دنیا ان کے افکار و نظریات سے نصف صدی سے واقف ہے ، اور ان کے نقطہ ہائے نظر سے اختلاف کرنے والے بھی ان کو نظرانداز کرنے کی کبھی جرأت و جسارت نہیں کر سکے ۔ مخالف حلقے بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے ادبی تنقید کو اس طرح ایک نئی جہت دے کر اسے ادبی تخلیق کے مذاق اور ذوقِ سلیم سے آشنا کیا ۔ عام طور پر ہمارے یہاں ناقد اور محقق کا منصب الگ الگ سمجھا جاتا ہے ، لیکن پروفیسر ممتاز حسین نے اس تاثر کی نفی کی اور اپنی تحریروں کے ذریعے ثابت کیا کہ تحقیق و تنقید کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اور تحقیق کے بغیر تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا ۔ مرزا غالب ، امیر خسرو اور مولانا حالی کے شعری نظریات پر ان کی گراں قدر تصانیف اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں ۔ اس کے علاوہ باغ و بہار اور انتخابِ غالب کے مقدمات اور اپنی دیگر تصانیف میں بھی انھوں نے تخلیقی طریقۂ کار بڑی خوبی سے برتا ہے ۔

پروفیسر ممتاز حسین کا منبع علم و فضل بڑا وسیع اور گنجینۂ فکر و شعور کثیرالجہت تھا ۔ مغرب و مشرق کے ادبی و علمی ورثے کے اصل سرچشموں (original sources) تک ان کی رسائی تھی اور وہ قدیم و جدید ادبی سرمائے پر یکساں نظر رکھتے تھے اور دونوں کا مطالعہ انھوں نے گہری بصیرت کے ساتھ کیا تھا ۔ عملی تنقید کے میدان سے ہٹ کر نظری تنقید میں بھی انھوں نے بے مثل کارنامے انجام دیے ۔ ان کے متعدد مضامین اور مقالے اس معیار کے ہیں جن کا تقابل مغربی نقادوں کے علمی اور تنقیدی مقالات سے کیا جا سکتا ہے ۔

پروفیسر ممتاز حسین جدید تر ادبی مسئلوں اور رویوں سے ہمہ وقت آگاہ و باخبر تھے اور نت نئے رجحانات و میلانات پر ان کی گہری نظر تھی ۔ یہ مسائل خواہ نظری ہوں یا ہیئت و اسلوب سے متعلق ہوں ، ان پر ان کی یکساں گرفت تھی اور وہ اپنے

مضامین میں وقتاً فوقتاً ان پر اپنی رائے دے کر ہم عصر ادبی دنیا کی رہنمائی کرتے رہتے تھے۔ ان کا ذوقِ سلیم اور وحدتِ فکر کسی مرحلے اور حالت میں ابہام و انتشار کا شکار نہیں ہوئے۔

مرحوم نے اپنے ایک فکر انگیز مضمون ادب اور غیر ادب میں آج کی شاعری میں کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھا:

" ہماری اپنی کلاسیکی شاعری کے دور میں زیادہ دور تک جانے کی ضرورت نہیں، میر اور سودا کا زمانہ لے لیجیے۔ ان کے زمانے میں شاعری ایک اسپرٹ ہی نہیں بلکہ ایک فن بھی تھی۔ اس کے کچھ اصول و قواعد تھے۔ وہ فن ہماری تہذیبی زندگی کے مختلف مظاہر اور ہمارے مہذب اور شائستہ جذبات اور گوناگوں خیالات کے اظہار کا ایک فن کارانہ یا جمالیاتی ذریعہ تھا۔ شاعری جہاں انسانی تعلقات و انسانی شعور کا ایک جنوں خیز مظہر ہے، جسے میں اسپرٹ سے تعبیر کرتا ہوں، وہاں ایک فن، مشق و ممارست، ریاض و ذوق سے تعلق رکھنے والی شے بھی ہے۔ چنانچہ میر ایسا شاعر جو ہمہ تن آگ تھا، بگولہ تھا، جس کی شاعری پر اس کا اپنا یہ مصرع چسپاں ہوتا ہے: 'کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ' .... وہ جب فنِ شاعری کے تعلق سے اپنے ریاض کے بارے میں لکھتا ہے تو اسے خودکشی سے تعبیر کرتا ہے، مگر آج کی شاعری کی جنوں خیزی ریاض بہم پہنچانے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ جنوں ہو یا شعور کا اظہار، ان کے اس اظہار میں کسی ڈسپلن یا نظم و ضبط کا احساس نہیں ملتا ہے اور نہ کسی ایسے ذوق کا احساس ملتا ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس کی داشت و پرداخت کی گئی ہے۔

جس طرح استادی یا شاگردی کے رشتے کو اٹھا دیا گیا ہے، اسی طرح
اب مشق و ممارست کا تصور بھی ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا ہے
آج تو بعض حلقوں میں اس بات پر فخر کیا جاتا ہے کہ دیکھو ہم نے
لاشعور کے مدفون خزانے کو کس تحیر خیزی سے بکھیرا ہے، کیونکہ
منطق و حسن ابلاغ سے ناتا توڑا ہے اور قبل منطق ادوار زیست کی
لاعقلیت سے کام لیتے ہوئے پہچانے ہوئے لفظوں کو بھی انجانا اور
نامانوس کیا ہے"۔

اپنی اس ناقدانہ رائے کو برحق جاننے کے باوجود وہ نئی نسل سے مایوس نہ
تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ کیا شاعری اور کیا افسانہ نگاری، ان دونوں میدانوں میں
ہمارے بہت سے نوجوان ادیب اپنے ادبی ماضی سے رشتہ قائم کیے ہوئے سماجی
حقیقت نگاری اور تاریخی تنقیدی شعور کو بروئے کار لانے کی روایت کو مضبوط کر
رہے ہیں۔ وہ سپاٹ انداز بیان سے پہلو بچاتے ہوئے ایسی تخلیقات کی طرف مائل
ہیں جو تخیل کی فن کارانہ تخلیق سے تعلق رکھتی ہیں اور اب یہی آخرالذکر رجحان غلبہ
حاصل کر رہا ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین ایک ایسے ترقی پسند ناقد تھے جو مواد، ہیئت و اسلوب کو
یکساں اہمیت کا حامل سمجھتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں اصل مسئلہ شاعری میں وہ
قوت و توانائی و حسن پیدا کرنے کا ہے جو لوگوں کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے
کے ایک روحانی محرک بنے۔ ان کے نزدیک شاعری کی صورت اور ہیئت فن کارانہ
ہوتی ہے، تخیل کے حسن کا راز یا جمالیاتی اظہار کی صورت صرف اسی قسم کی شاعری
میں موضوع اور معروض کا اتحادِ کامل ہوتی ہے اور شاعری نری مصوری کے بجائے
زندگی کو حسین تر بنانے کا وظیفہ و فریضہ ادا کرتی ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین بلاشبہ نابغۂ اعظم تھے اور ان کو عہد ساز ناقد کی حیثیت

سے تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ ان کی غیر معمولی ادبی بصیرت اور علمی تبحر ہمیں ان کی یاد دلاتا رہے گا اور ان کے خلوص فن کے نقوش ہمارے افق ادب پر روشن ستاروں کے مانند درخشاں رہیں گے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر مرحوم کے حوالے سے نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اگست ۱۹۹۲ء

# پروفیسر مجتبیٰ حسین

پروفیسر مجتبیٰ حسین کو ادب کے افق سے اوجھل ہوئے ایک سال کا عرصہ بیت گیا، مگر وہ ایک ایسے روشن ستارے کی مانند تھے جو اپنی تحریروں اور فکر کے حوالے سے آسمان ادب پر عرصۂ دراز تک پوری تابندگی کے ساتھ چمکتے رہیں گے۔ ان کی ادبی حیثیت مختلف زاویوں سے یکساں وقیع اور محترم تھی۔ ان کی تنقید نگاری میں پائی جانے والی تہذیبی پاس داری کے ساتھ ندرت، وسیع النظری انھیں دیگر اربابِ نقد و نظر سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ ان کی تنقید نگاری ہر چند کہ ترقی پسندیت کی روایت کے زمرے میں آتی ہے، مگر وہ کسی کے مقلد نہیں کہے جا سکتے۔ ان کا زاویۂ نگاہ سکہ بند ترقی پسند ناقدین سے مختلف تھا۔ انھوں نے فن کو نظریات پر قربان کر دینے کی کبھی تائید نہیں کی۔ ان کے ہاں جمالیات کے اپنے معیارات تھے جو زندگی کے حقائق سے عبارت تھے۔ ان کی تنقید میں زندگی کی مثبت قدروں کی بڑی خوب صورت ترجمانی ملتی ہے۔ تجزیہ و تاثرات کے ساتھ اور کئی لہریں ان کے ہاں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ ان سب سے مل کر ان کی انفرادیت ابھرتی محسوس ہوتی ہے ان کی تنقید کی زبان کہیں بوجھل اور ثقیل نہیں ہوتی، بلکہ ان کی تحریروں میں

سادگی اور شگفتگی قارئین کے دل و دماغ پر خوش گوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ ان کے اسلوب کی سادگی اور شگفتگی یہ واضح کرتی ہے کہ انھوں نے جن مسائل اور موضوعات پر قلم اٹھایا، وہ ان کا ادراک ہی نہیں بلکہ معروضی حالات کے تناظر میں ان کا بھرپور شعور رکھتے تھے۔ وہ کہیں ابہام اور ایہام میں مبتلا نظر آتے بلکہ اظہار اور ابلاغ ان کے یہاں دو متوازی چلنے والی رو محسوس ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ اردو تنقید کی تاریخ میں وہ ایک مستند نام کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔

مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے متعدد پہلو تھے اور ہر پہلو یکساں طور پر روشن و تاب ناک تھا۔ ان کی خوش گفتاری اور بذلہ سنجی کے تذکرے ان کے حلقۂ احباب میں آج بھی پسندیدہ موضوع سخن ٹھہرتے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں بحیثیتِ استاد ان کی قدر و منزلت، احترام استاد کی دیرینہ روایت کی تازہ مثال کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے سیکڑوں ذہنوں کو جِلا بخشی، علم و شعور کے نئے امکانات سے انھیں روشناس کرایا۔ وہ علم و دانش کا ایک سرچشمہ تھے جس سے ہزاروں مشتاقان علم و دانش نے فیض حاصل کیا اور اپنی تشنگی بجھائی۔

وہ دانش وروں اور ادیبوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کا کمٹمنٹ سماجی زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے ہمیشہ پیوستہ رہتا ہے۔ انسانیت دوستی ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ وہ صلح جوئی اور خلوص و محبت کا پیکر تھے، اور انھوں نے اپنی محبتوں کو بانٹنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام ایک ایسی کانفرنس میں شرکت میں گزرے جو ہم عصر معاشرے کا مرکزی موضوع بنا ہوا ہے یعنی جمہوری عمل کا فروغ۔ لاہور میں جمہوریت پسند مصنفین کی سہ روزہ کانفرنس معاشرے میں غیر جمہوری نظریات اور ان کے عملی مظاہر کے خلاف اور جمہوری عمل کی تائید میں ادیبوں کی حمایت کے اظہار کے لیے منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ان کی پرجوش شرکت سماج سے ان کے کمٹمنٹ پر دلالت کرتی ہے

ان کی عالمانہ اور وابستگی سے بھرپور تقریر کے الفاظ آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں ۔ معاشرے میں ادیبوں کے فعال کردار کا ایک ایسا مظاہرہ ..... وہ اس قدر خوش اور مطمئن تھے کہ طمانیت سے ان کا چہرہ دمکتا ہوا نظر آتا تھا ۔ مرحوم اتنے ہشاش بشاش اپنی زندگی میں کم ہی نظر آئے ہوں گے جتنے وہ اس کانفرنس میں نظر آئے تھے ۔ غرض یہ کہ ان کی زندگی کا اختتام کانفرنس کے بعد واپسی پر ایک حادثے کے نتیجے میں ہوا جو ایک عظیم المیہ تھا ۔ آخری ایام میں ان کی قربت کے نقوش ہمارے ذہن کے گوشوں میں اسی طرح تروتازہ ہیں :

حق مغفرت کرے ! بڑا آزاد مرد تھا

ان کی پہلی برسی موقع پر "طلوع افکار" نے ان کا گوشہ شائع کر کے ان کی یاد کو ایک حقیر سا نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ کاش یہ گوشہ ہم ان کی زندگی میں شائع کر پاتے اور اس طرح اپنی زندہ دوستی کا ثبوت پیش کر سکتے !

مارچ ، ۱۹۹۰ء

# تابش دہلوی

تابشؔ ! یہ کم نہیں ہے کہ اس آن بان سے
اس عہد میں ہو زندہ دل مبتلا کے ساتھ

حضرتِ تابش دہلوی کا یہ مقطع ان کے دوسرے مجموعۂ غزلیات "چراغِ صحرا" کا آخری شعر ہے۔ یہ شعران کے فکری و فنی رویوں کا یکساں ترجمان و نمائندہ ہے جس سے ان کی شخصیت و فن کے مختلف النوع پہلوؤں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ان دو مصرعوں میں ان کا عصری شعور بھی قاری پر منکشف ہوتا ہے اور زندگی برتنے میں اثباتیت کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ بظاہر انتہائی سادگی سے اپنے عہد کے کرب آگیں حقائق کا اظہار شاعر نے کیا ہے، لیکن قاری ان دو مصرعوں کی تہ داریوں پر تفکر کرے تو وقت کے سفر اور مراحل سفر کے نو بہ نو مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آئیں گے اور معاشرے کے خدوخال کن تجربات و حوادث سے دو چار ہو کر تشکیل پذیر ہوئے ہیں، وہ بھی راز نہیں رہیں گے۔ ادب اور سماج کے رشتوں کی قدرو قیمت کا بھرپور ادراک شاعر کے فن کے حوالے سے عمومی نقطۂ نظر کا مظہر ہے۔

تعلق " دل مبتلا" کی ترکیب میں کمال ہنرمندی سے بیان ہوا ہے۔ جناب تابش کی شاعری جذبہ و احساس کی صداقتوں کی علم بردار بھی ہے اور سماجی اقدار کی آئینہ دار بھی۔ ان کے ہاں ادب زندگی کا ترجمان بھی ہے اور تنقید حیات بھی۔ دروں بینی کے ساتھ ان کے ہاں ہر مقام پر گرد و پیش اور سماجی زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتیں قاری کو اپنی طرف متوجہ رکھتی ہیں اور مطالعۂ حیات کا سلیقہ اور شعور بخشتی ہیں اور بدترین حالاتِ زندگی اور انتہائی ناخوش گوار ماحول میں بھی آن بان سے جینے کی دعوت دیتی ہیں۔

زیرِ نظر شمارہ حضرتِ تابش دہلوی سے منسوب ہے۔ کراچی کی ادبی دنیا آج جن چند شخصیتوں کے حوالے سے جانی پہچانی جاتی ہیں، ان میں جناب تابش دہلوی کا نام بہت نمایاں بلکہ روشن ترنام ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۲۳ء سے کیا، گویا ان کا یہ سفر کم و بیش سات دہائیوں سے جاری ہے اور ہماری اور ہمارے قارئین کی دلی تمنا اور دعا ہے کہ ان کا یہ سفر تادیر اسی آن بان سے جاری رہے تاکہ شاعری کا بالعموم اور غزل کا بالخصوص اعتبار اور بھرم قائم و دائم رہے اور فکرِ تابش سے افق شعر و فن کی تابندگی فزوں تر ہوتی رہے۔

شمارے میں شامل ان کے کوائف ذات کے مطالعے سے قارئین پر تابش صاحب کی فکر و شعور کی تربیت میں ان کے گھریلو ماحول کا کردار اور اثرات منکشف ہو جاتے ہیں۔ وہ دہلی کے ایک انتہائی ثقہ اور مستند ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انتہائی کم سنی میں ان کے ادبی سفر کی خبر قاری کو کسی حیرت و استعجاب میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ مطمئن کرتی ہے کہ فرد کی ذہنی اور شعوری تربیت و تشکیل میں سماج کی بنیادی اکائی، یعنی خاندان کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ چنانچہ جس علمی اور ادبی ماحول میں جناب تابش نے آنکھ کھولی، ان کا ادب و شعر سے

عہدِ طفولیت سے چولی دامن کا ساتھ ہونا ایک فطری و منطقی بات ہے ۔ وہ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ ان کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں ہوئی ۔ ۱۹۳۰ء میں دہلی سے میٹرک پاس کیا اور اٹھائیس برس بعد ۱۹۵۸ء میں کراچی یونی ورسٹی سے گریجویشن کی سند حاصل کی ۔ ملازمت کا ۱۹۳۲ء سے ابتدائی عرصہ حیدرآباد دکن میں گزارا اور ۱۹۴۰ء میں دہلی میں ریڈیو سے وابستہ ہوئے ۔ یہ وابستگی ۱۹۸۰ء تک قائم رہی اور ریٹائرمنٹ پر منتج ہوئی ۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی آگئے اور یہیں کے ہو رہے ۔ ان حقائق کا یہاں بیان کرنا میں نے اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ جناب تابش کے ذہنی سفر اور شعوری زندگی کے ارتقائی عمل میں جو مختلف مقامات کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں اور روایتوں کی کارفرمائیاں رہی ہوں گی ، ان کا صحیح تناظر میں قاری کو ادراک رہے ۔

تابش صاحب کو برصغیر کے اہم ترین تہذیبی اور سیاسی مراکز میں زندگی گزارنے اور مشاہدات و تجربات سے دوچار ہونے کا موقع ملا جن کا براہِ راست اثر ان کی شخصیت اور فن پر مرتب ہونا عین قرینِ قیاس ہے ، یہی وجہ ہے کہ تابش صاحب کی فکر و فن میں جس وسعت اور تنوع کا احساس ہوتا ہے ، وہ ان کے سفرِ حیات پر دال ہے:

حدیں آفاق کی چھولی ہیں میں نے
بہت آپے سے باہر ہو گیا ہوں

خلوص و انکسار جو ان کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے ، وہ ان کی شاعری کی بھی نمایاں اور امتیازی خصوصیت ٹھہرتی ہے ۔ تعصب و تنگ نظری سے ان کی ناوابستگی ، بلند نگہی ، فراخ دلی اور روشن خیالی کی لہریں ان کے فن کو نکھارتی اور سنوارتی ہوئی نظر آتی ہیں:

لب پہ دنیا کی شکایت بھی نہیں
ہو گئے ہیں ہم بھی دنیا دار کیا

دل کو رعنائیِ غم بھی دے دی
آپ نے اپنے لیے کیا رکھا؟

سہلِ ممتنع میں تابش صاحب کو فن کے معیارِ جمال کو قائم رکھتے ہوئے شعری سحر کو جگانے کا فن خوب آتا ہے۔ سادگی میں فنی اور فکری پرکاری کی بہترین مثالیں ان کے دونوں مجموعۂ غزلیات "نیمروز" اور "چراغِ صحرا" میں کثرت سے ملتی ہیں۔ زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس کا اظہار ان کی شعری نگارشات میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مشکل تراکیب و لفظیات سے شاعری کو آزاد کرانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ منزل بڑی مشق اور فنی پختگی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ تابش صاحب کو یہ منصب حاصل ہوئے عرصۂ دراز گزر چکا ہے۔ ان کے ہاں سادگی میں پرکاری کے ساتھ تہ داری کا عنصر وقت کے ساتھ غالب تر ہوتا گیا ہے۔ ان کی فکر میں جو وسعتیں دکھائی دیتی ہیں، وہی ان کے اظہار و بیان میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی ذہنی تربیت و نشو و نما میں پورے برِصغیر کے ثقافتی ورثے کی کارفرمائی رہی ہے، نتیجتاً ان کے طرزِ احساس اور طرزِ اظہار میں برِصغیریت دکھائی دیتی ہے۔ ان کے لہجے اور شعری رویے میں کاسموپولٹنزم (cosmopolitanism) کا احساس موج زن ہے جس سے برِصغیر کے مختلف تہذیبی مراکز کے دھارے اور رجحانات کا خوب صورت امتزاج ابھرتا ہے۔

ان کے شعری رکھ رکھاؤ میں دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی کی جھلک بھی ملتی ہے اور حیدرآباد دکن کے تہذیبی ماحول کا عکس بھی۔ کراچی کو تاریخ نے برِصغیر کے تمام خطوں اور مراکز کے ثقافتی اور تہذیبی دھاروں کا سنگم بنا دیا، چنانچہ کراچی جناب تابش کے لیے بیک وقت لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد دکن کا نعم البدل ثابت ہوا، یہی وجہ ہے کہ جناب تابش کے یہاں وہ کش مکش اور کشاکش نظر نہیں آتی جو دوسروں کی شخصیت اور فن میں پائی جاتی ہے۔ تابش صاحب کراچی کے کاسموپولٹن

(cosmopolitan) مزاج اور کلچر سے کبھی نامانوس دکھائی نہیں دیتے۔

جناب تابش نے تمام تر اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل ہی ان کی اصل جولاں گاہ اور ان کی پہچان بنتی ہے۔ غزل بیشتر اردو شعرا کی طرح تابش صاحب کی سب سے پسندیدہ بلکہ محبوب صنف ہے۔ انھوں نے غزل سے اپنے عشق کو کبھی مخفی نہیں رکھا۔ "نیروز" اور "چراغ صحرا" غزلوں کے دو مجموعوں کے حرفِ آغاز میں انھوں نے غزل کی بڑی مدلل وکالت کی ہے اور غزل سے اپنی بے پناہ وابستگی کا جواز مہیا کیا ہے۔

"نیروز" (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کے حرفِ آغاز میں انھوں نے تحریر کیا:

"ہماری شاعری کی اعلیٰ ترین صنف غزل ہے، اور صرف غزل ہی میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی، غرض ان تمام شعبہ ہائے حیات کو جن کا تعلق انسان اور انسان، انسان اور کائنات کے رشتوں سے ہے، اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات کو لبِ اظہار بخشتی ہے"۔

"چراغ صحرا" میں غزل سے دیرینہ عشق کے اظہار میں تابش کا لہجہ کچھ اور توانا اور نکھرا ہوا ملتا ہے۔ ان کے لفظوں میں:

"غزل نے ہر دور میں اپنے دور کی ثقافت کی پوری پوری ترجمانی کی ہے۔ غزل ہر دور میں بچی رہی ہے اور بچی رہے گی۔ معاشرے کی عکاسی کا جو قرینہ غزل کو حاصل ہے، وہ کسی اور صنفِ شعر کو میسر نہیں"۔

غزل کے ہم گیر ارتقائی سفر میں بقول تابش:

"غزل کی موجودہ ترقی کو کسی ایک تحریک، کسی ایک

مکتبِ خیال یا کسی ایک شخصیت سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اس
کی ترقی میں دلی، لکھنؤ ہی کے مکتبِ شاعری کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ ہر وہ
خطۂ زمین جہاں اردو کا رواج ہے، شامل ہے "۔

غرض یہ کہ تابش کے شعری ورثے میں غزل کو جو خاص منصب حاصل ہے، اس پر دو
رائیں قائم نہیں کی جا سکتیں۔ ہر چند کہ ان کے ہاں غزل کا کلاسیکی رنگ غالب اور
حاوی رنگ کا درجہ رکھتا ہے، مگر ان کے شعر و فن کا غائر مطالعہ کرنے کی صورت میں
بیسویں صدی میں غزل میں جو رجحانات اور رویے ابھرے، جس طرزِ احساس کو جگہ
ملی، جو حسیت برتی گئی، جو لہجہ اپنایا گیا اور جن لفظیات کو اعتبار حاصل ہوا، تابش
صاحب ان تمام تغیرات اور تبدیلیوں سے صرف باخبر نہیں رہے بلکہ انھوں نے خود
کو ان سے متعارف رکھا اور انھیں اپنے شعر و فن میں کامیابی کے ساتھ برتا بھی۔ یہی
وجہ ہے کہ ان نگارشات میں ہم عصر زندگی اور ہم عصر فنی محاسن و لوازمات پوری آب
و تاب کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

غرض یہ کہ جناب تابش کی شاعرانہ زندگی، جو گزشتہ سات دہائیوں پر محیط
ہے، خوب سے خوب تر کے سفر پر آج بھی گام زن ہے۔ وہ آج بلاشبہ برِصغیر کے ان
بزرگ ترین شعرا میں سے ہیں جن کو مسلم الثبوت استادِ فن کا منصب حاصل ہے اور
اردو کا شعری سرمایہ جن کے جواہر پاروں سے وقیع تر گردانا جاتا ہے۔

اکتوبر، ۱۹۹۲ء

# ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں جب بھی میں نے سوچا اور ان پر اظہارِ خیال کرنے کی نیت کی ، وہ ہمیشہ میرے ذہن میں ایک بڑے موضوع کی حیثیت سے ابھرے ۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک بڑے موضوع کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔ وہ ایک ایسا بڑا موضوع بن چکے ہیں جس کے بہت سے ذیلی موضوعات ہمارے سامنے ہیں ۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ اقبال اور فیض کی طرح اپنی زندگی میں ایک legend بن گئے ہیں ، مگر یہ کہنے میں جھجک محسوس نہیں کروں گا کہ ان کے ادبی منصب کا بڑے وسیع تناظر میں اعتراف (acknow l edgement) کیا جا چکا ہے جو ان کے ہم عصروں میں بہت کم لوگوں کو میسر ہوا ہے ۔ ان کی ادبی عظمت عرصے سے غیر متنازعہ بن چکی ہے اور ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کی خلاقیت کے قائل ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں ۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد ، خدائے بخشندہ

ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے روایتی گفتگو کرتے وقت کچھ ایسا لگتا ہے کہ میں

موضوع سے انصاف نہیں کر رہا ہوں۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں، ایک ادارہ ہیں اور ایک تحریک ہیں تو لکھتے وقت یہ تاثر ابھرتا ہے کہ یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی، کیونکہ وہ تو واقعی ایک ادارہ، ایک انجمن اور ایک تحریک ہیں۔ یہ کہنا ان کی مدح سرائی کے ضمن میں نہیں آئے گا، یہ تو حقیقتوں کے اعتراف کے خانے میں آئے گا۔ سورج کو سورج اور چاند کو چاند کہنا کوئی بڑائی بیان کرنا تو نہیں ہوا۔ یہاں یہ کہنا کہ وہ کچھ مختلف قسم کی انجمن، مختلف قسم کا ادارہ اور مختلف قسم کی تحریک ہیں تو یہ بات یقیناً ان کی انفرادیت پر دلالت کرے گی۔ انھوں نے باضابطہ طور پر کوئی تحریک نہیں چلائی کوئی ادارہ اور انجمن وغیرہ نہیں بنائی؛ وہ کسی تحریک کے بانی نہیں بنے؛ بلکہ ان کا شعوری سفر اور ادبی زندگی کا آغاز ایک ایسے عہد میں ہوا جب برصغیر میں ترقی پسند تحریک کا طوطی بول رہا تھا اور اس کا اثر اردو زبان سے نکل کر برصغیر کی دوسری اہم ترین زبانوں کے ادب پر مرتب ہو رہا تھا، اس کا دائرۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہو رہا تھا اور بلاشبہ ایک عشرے میں ترقی پسند تحریک اردو ادب کی سب سے بڑی تحریک بن چکی تھی۔ آغا صاحب بڑی خاموشی سے لکھتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ادب کے افق پر نمایاں سے نمایاں تر ہوتے گئے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کے ہم عصروں نے ان کی تحریروں اور تخلیقی کارناموں کو سراہنا شروع کیا اور پھر وہ وقت آگیا جب ان کا ادبی قامت بلند ہونا شروع ہوا اور ان کی ادبی شخصیت کی سحرانگیزی (charisma) کے اثرات ظہور پذیر ہونے لگے۔ وہ ایک ایسے تخلیق کار کے منصب پر فائز ہوتے گئے جو رجحان ساز اور عہد ساز ہونے کا دعوے دار ہوتا ہے۔ بغیر کسی تحریک اور انجمن کے ان کا حلقۂ اثر بڑھتا گیا اور وہ اپنے معاصرین کو متاثر کرنے لگے۔

بقول مشفق خواجہ:

"وزیر آغا ان لکھنے والوں میں سے ہیں جو اپنے عہد کی

شناخت بن جاتے ہیں۔ یہ بات میں نے کسی عقیدت کی بنا پر نہیں
کہی کہ ادب کے حوالے سے مجھے کبھی کسی سے عقیدت نہیں ہوئی۔
ادب کے ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے گزشتہ کئی صدیوں کے ادبی
جزر و مد کو بہت قریب سے دیکھنے کی بنا پر یہ نکتہ میرے ہاتھ آیا ہے
کہ لکھنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو اپنے عہد سے
پہچانے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جن کے حوالے سے ان کے عہد کو
پہچانا جاتا ہے۔ اول الذکر طبقے میں شامل ادیب کسی عہد کے ادب
کی مجموعی قدر و قیمت کے تعین میں مدد دیتے ہیں اور دوسرے طبقے
میں شامل ادیب اپنی زبردست تخلیقی توانائی اور فکری انفرادیت کی
وجہ سے اپنے عہد اور آنے والے عہد کے درمیان رابطے کی علامت
بن جاتے ہیں اور ادبی روایات انھی کے ذریعے ایک عہد سے
دوسرے عہد کو منتقل ہوتی ہیں اور یوں انھی کے حوالے سے ان
کے عہد کو پہچانا جاتا ہے"۔

غرض یہ کہ آغا صاحب ایک تحریک، ایک انجمن اور ایک ادارہ بنتے گئے مگر مختلف
انداز کے، مختلف نوعیت کے اور مختلف سج دھج کے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی کثیر الجہتی بھی ذرا
مختلف قسم کی ہے۔ عام معنوں میں بھی وہ کثیر الجہتی کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔
انھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور اپنے انمٹ
نقوش چھوڑے ہیں۔ شاعری، تنقید، انشائیہ، ادبی صحافت اور فکریات، سبھی شعبوں
میں انھوں نے گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں جن کا وسیع پیمانے پر پوری اردو دنیا
میں اعتراف (acknowledgement) ہو چکا ہے۔ ان کی کثیر الجہتی میرے
نزدیک ان کی خرد افروزی اور وسیع النظری سے عبارت ہے۔

انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اپنے ادبی سفر کے حوالے سے کہا:

"شاعری میں فیض نے مجھے بے حد متاثر کیا اور افسانہ نگاری میں کرشن چندر نے۔ ان میں بعد ازاں فیض صاحب سے دو، تین بار ملاقات بھی ہوئی، مگر فاصلہ برقرار تھا۔ میں جب ۱۹۶۳ء میں بمبئی گیا تو کرشن چندر سے کئی بار ملا اور ہم نے ذہنی طور پر خود کو ایک دوسرے کے بہت قریب محسوس کیا"۔

فیض سے متاثر ہونے اور کرشن چندر سے ذہنی قربت کا اظہار کر کے آغا صاحب نے ادب میں اپنے اس رویے کا اظہار کیا جو ایک بڑے ادیب کا منصب ہوتا ہے۔ عام طور پر آغا صاحب کو ان کے بعض رفقا ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک فریق کے روپ میں پیش کرتے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آغا صاحب کی فکری اور نظری جہتیں ہم سے زیادہ غائر مطالعے کی طالب ہیں ۔ وہ ایک ایسے صاحبِ علم و فضل تخلیق کار ہیں کہ تنگ نظری (sectarianism) ان کے مزاج شعر و سخن میں جگہ نہیں پا سکتی۔ انھوں نے ادبی تحریکوں، رویوں اور رجحانات کا مطالعہ عام ڈگر سے ہٹ کر کیا ہے۔

جدیدیت کی تحریک کے بارے میں انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا:

" جدیدیت کی تحریک ایک بڑی تحریک ہے۔ ہمارے ہاں علامہ اقبال اسی تحریک کے تحت آئے، ترقی پسندی بھی اسی کا ایک رخ تھی ۔ ترقی پسندوں نے جدیدیت کی پوری تحریک سے صرف معاشی نظریے کو اپنایا، باقی باتیں چھوڑ دیں"۔

آغا صاحب کے یہ فقرے سوچ کی نئی سمتوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ جدیدیت اور ترقی پسندیت، دونوں کے باب میں انھوں نے روشِ عام سے ہٹ کر رائے زنی کی ہے، چنانچہ جدیدیت کی تحریک کے معنی و مفہوم آغا صاحب کے ہاں

وہ نہیں ہیں جو عام طور پر لیے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کا حوالہ دے کر آغا صاحب نے جدیدیت کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے انتہا پسندوں کے اندازِ فکر اور ادب کے بارے میں ان کے نظریات کی نفی کی ہے جن کے ہاں ادب درونِ ذات سے شروع ہو کر درونِ ذات پر ختم ہونے کا سفر ہے، جن کے نزدیک اظہار ادب کا منصبِ اول و آخر ہے اور ابلاغ ادب کا مسئلہ نہیں ہے۔ آغا صاحب کے نظریۂ ادب کی سرحدیں بڑی وسیع ہیں اور اپنے اندر مختلف دھاروں، زاویۂ نظر اور فکری و ذہنی رویوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان ان کا فن رابطے کی کڑی اور ان کے درمیان توازن کی اساس بھی فراہم کرتا ہے۔ ترقی پسندیت کے حوالے سے ان کی رائے اس حد تک ضرور صائب مانی جائے گی کہ بیشتر ترقی پسند شاعروں اور نثر نگاروں نے طبقاتی کش مکش اور (economic determinism) کے نظریے کو زیادہ اہمیت دی اور ادب کے معیارِ جمال کو ثانوی، مگر کسی بھی تحریک کی نمائندگی یا پہچان ہجوم اور بھیڑ سے نہیں ہوتی بلکہ ان سے ہوتی ہے جو اپنے عہد کی پہچان بن جانے کے اہل ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں ایسے کئی نام ہیں جو ادب میں ہمیشہ اعتبار و معیار ٹھہریں گے۔ جدیدیت کی تحریک کے بارے میں بھی یہی بات کہی جائے گی اور یہ کہنا نادرست ہوگا کہ تین دہائیوں کے سفر میں یہ تحریک لاشعوری بوالعجبیت، لایعنیت، ذاتی علامتیت، لسانی تشکیلیت اور سریت وغیرہ کے گرداب میں الجھ کر بے سمتیت کا شکار ہو کر اپنی معنویت کلیتہً کھو بیٹھی۔ ادب کی تاریخ میں اس تحریک یا رجحان کے حوالے سے کچھ ایسے نام نہیں ابھریں گے جن کو اپنے عہد کی پہچان ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس کی سب سے روشن دلیل ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی وسیع النظری و وسیع المشربی ان کی فکری و تخلیقی جہتوں کو متعین کرتی ہے جو ان کی ادبی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے۔ روایت و درایت، منقولات و معقولات، تقلید و اجتہاد ان کے نظریات میں تضادات کے بجائے توازن

اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا باعث بنے ہیں۔ جن اصناف کو انھوں نے اپنی تخلیقی توانائی کے اظہار کا ذریعہ بنایا، ان میں تو ان کے رویے اور treatment سے سبھی واقف اور اس کے معترف ہیں، مگر انھوں نے ان اصنافِ ادب پر اپنی رائے بڑے غیر مبہم انداز میں دی ہے جن سے ان کی وسعتِ فکر و نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہیئت و اسلوب کا مسئلہ ہو یا مواد اور فکری رویوں کا، وہ کہیں سکوتِ مصلحت اندیش سے کام نہیں لیتے۔

نثری نظم کے ضمن میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا:

"نظم میں تین انداز مروج ہیں: پابند، آزاد اور معرا۔ میں نے ابتداءً پابند اور معرا نظمیں لکھیں لیکن بعدازاں آزاد نظمیں کہی ہیں۔ رہا نثری نظم کا مسئلہ تو یقین جانیں یہ وہ واحد مسئلہ ہے جس پر محترم احمد ندیم قاسمی اور میں ایک دوسرے سے سو فی صد متفق ہیں۔ وہ نثری نظم کو شاعری نہیں مانتے اور میں بھی اسے شاعری تسلیم نہیں کرتا، البتہ ندیم صاحب نثری نظم کو بطور ایک صنفِ ادب کے مسترد کرتے ہیں جبکہ اسے نثرِ لطیف کی حیثیت میں فروغ پاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا موقف یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی صنفِ ادب کو پلیچھ یا پلید کہہ کر مسترد نہیں کرنا چاہیے"۔

آزاد غزل کے حوالے سے انھوں نے رائے زنی کرتے ہوئے کہا:

"میں ادب میں ہر قسم کے تجربے کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اگر آزاد غزل والے شاعری کے اعلیٰ نمونے تخلیق کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو اس سے اردو ادب کو یقیناً بہت فائدہ ہو گا۔ تجربہ مقصود بالذات نہیں ہونا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ تجربے سے نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ نثری نظم کے بارے میں میرا موقف یہ رہا

ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ نثر کی توسیع ہے۔ آزاد غزل کے
بارے میں میرا موقف یہ ہے کہ یہ یقیناً شاعری ہے اور اسے شاعری
کی میزان پر تولنا چاہیے"۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی رائے ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن سے مکالمہ ہو سکتا ہے۔ یہ رائے بڑی صائب بھی ہے اور وقیع بھی۔ یہ وصف ڈاکٹر وزیر آغا کی خلاقیت کے ساتھ ان کے تبحرِ علمی سے عبارت ہے۔ ان کے نظریۂ شعر اور شعری نگارشات کے باب میں خصوصی گفتگو درکار ہے جس کا یہ اداریہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ اصنافِ ادب میں شاعری انھیں سب سے زیادہ عزیز ہے جس کے بارے میں ان کا یہ جملہ بھلائے نہیں بھولتا کہ "شاعری میری پہلی اور آخری محبت ہے"۔ شاعری سے ان کی غیر معمولی وابستگی بڑی منطقی بات ہے، کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک تخلیق کار ہیں اور تخلیقیت ان کے رگ وپے میں رچی بسی ہے۔ ان کی شعری زندگی کم و بیش نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کا یہ عرصہ تاریخ کے اہم ترین ادوار میں شامل ہو چکا ہے۔ وہ ایک صاحبِ نظر اور صاحبِ دل تخلیق کار ہیں۔ ان کی شاعری میں روحِ عصر ہر جگہ بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن مختلف لہجے اور مختلف انداز میں۔ ان کے یہاں عصری شعور کا اظہار دوسروں سے بہت مختلف روپ لیے ہوئے ہے۔ عصری شعور و ادراک ان کی شعری نگارشات میں کرب اور دکھ کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے اندر ایک گوتم اور کبیر داس ہے جو انسانی معاشرے کے دکھوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور یہ مطالعہ اور مشاہدہ ان کے ہاں وارداتِ قلب بن کر الم ناک کرب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جسے وہ سیاحتِ قلب کا مرحلہ قرار دیتے ہیں، جس کا اظہار وہ بڑی احتیاط اور بڑی تہ داری بلکہ رازداری کے ساتھ کرتے ہیں اور جس کا ابلاغ بعض اوقات آسان نہیں ہوتا۔ وہ اپنے قاری کو اپنا ہم سفر بنانا چاہتے ہیں۔

اپنی نظم نردبان کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

"میرا موقف یہ ہے کہ پس منظر سے آگاہی نظم سے لطف اندوز ہونے کے عمل کو مہمیز لگاتی ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قاری تجرید کی فضا میں بالا بالا اڑ جانے کے بجائے اپنی جملہ حسیات کی مدد سے اس ارضی ماحول کو محسوس کرتا ہے جو نظم کا عقبی دیار ہے اور اس کا منبع اور مخرج بھی، لیکن ظاہر ہے کہ قاری کو ہر نظم کے عقبی دیار کا علم نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود شاعر اس کی رہ نمائی نہ کرے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ خود شاعر اپنی زندگی کی کہانی کے محسوساتی رخ کو یوں قلم بند کرے کہ اس کی ہر نظم کا سیاق و سباق ایک حد تک روشن ہو جائے یا پھر شاعر کے ساتھ شام منانے کی روایت میں یوں تبدیلی کی جائے کہ اسے سامنے بٹھا کر اس پر مدح اور خوشامد کے پھول برسانے کے بجائے شاعر سے صرف یہ فرمائش کی جائے کہ وہ اپنی نظمیں سنائے اور ساتھ ساتھ ان کے عقب میں پھیلے ہوئے اپنے تجربات کے خد و خال بھی دکھاتا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خود نظم اپنے عقبی دیار اور اس کے ارضی مظاہر سے اس درجہ منسلک ہو کہ قاری کو شاعر کے تجربے میں شرکت کا موقع مل سکے"۔

میرے نزدیک قاری سے اس قدر صبر آزما مشقت کا طالب ہونا قاری کے ساتھ ساتھ خود شاعری کو بھی آزمائش سے دوچار کرنا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہ مشقت شاعر اور قاری کو ایک دوسرے سے دور کرتی جائے گی اور شاعری کا دائرۂ اثر سمٹتا چلا جائے گا جو میرے خیال میں کوئی فال نیک نہیں۔

اپنی گفتگو میں جناب مشفق خواجہ کی درج ذیل سطور پر ختم کرتا ہوں:

"ڈاکٹر وزیر آغا کی تخلیقی توانائی اور فکری انفرادیت کا اظہار شاعری، تنقید اور انشائیے میں ہوا ہے۔ یہ تینوں اصنافِ ادب ان کے تخلیقی سفر کی تین مختلف منزلیں نہیں بلکہ تین مختلف پیرائے ہیں، ادب کو زندگی کے حوالے سے اور زندگی کو ادب کے حوالے سے سمجھنے سمجھانے کے تین مختلف اسلوب ہیں۔ شاعری میں انھوں نے زندگی کی گہرائی کو، تنقید میں وسعت کو اور انشائیے میں تنوع کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب رہے ہیں، اس کا اندازہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن فیصلہ کل ہوگا"۔

مارچ، ۱۹۹۳ء

# شان الحق حقی

تھا نشان بہار میں شامل
اک ہمارا بھی تارِ پیراہن

ڈاکٹر شان الحق حقی اردو ادب کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں اور کم از کم چار دہائیوں سے وہ ہماری ادبی دنیا کے ایک مستند اور معتبر نام ہیں۔ اس وقت اردو ادب اور اردو دنیا جن چند شخصیتوں کے حوالے سے جانی پہچانی جاتی ہے اور جو لوگ سند اور اعتبار کا باعث ہیں، ان میں حقی صاحب کا نام اہم اور نمایاں ہے۔ اگر دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی کی طرح دبستان کراچی اور دبستان لاہور کی اصطلاحات اور حوالے کسی معنویت کے حامل ہیں تو آج دبستان کراچی کی توقیر، بھرم اور آبرو جن چند ناموں سے قائم ہے، حقی صاحب ان میں سے ایک نام ہیں اور اہم نام ہیں۔ ان کی زندگی کا سفر حصول علم و ادب اور فروغ علم و ادب کا سفر ہے۔ ان کی شخصیت کی اول و آخر شناخت علم و ادب کے حوالے سے بنتی ہے۔ ہر چند کہ وہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور ان کا سماجی منصب ہمیشہ بہر طور قابل رشک رہا ہے، مگر ادب ان کی زندگی اور عشق رہا۔ عروس ادب

سے ان کا عشق وقت کے ساتھ پختہ تر ہوتا گیا۔ انھوں نے اس عشق کے تقاضوں کا ہمیشہ خیال رکھا اور انھیں پورا کرنے میں ساری عمر پیش پیش رہے۔ آج بھی وہ فرہادِ ادب بنے شیرینِ ادب کی رضاجوئی کے لیے شیر لانے کے لیے سرگرداں اور ہمہ تن مصروفِ کار ہیں۔

بقول ڈاکٹر ممتاز حسن:

"شان الحق حقی، جو 'شان الحق'، شان صاحب اور چاند صاحب (گھر کا نام) بھی کہلاتے ہیں، ۱۵ ستمبر، ۱۹۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب بارھویں پشت میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ملتا ہے۔ شان الحق حقی کے والدِ بزرگوار کا نام مولوی احتشام الدین حقی تھا جو مشہور ادیب اور شاعر تھے اور 'نادان' تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے حافظ شیراز کے کلام سے قلبی وابستگی کی بنا پر دیوانِ حافظ کا تمام و کمال ترجمہ اردو شعر میں کیا ہے۔ آپ کے نانا ڈاکٹر مشرف الحق ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے اور خود بڑے عالم و فاضل شخص تھے، برسوں جرمنی میں رہے اور مدتوں ڈھاکا یونی ورسٹی میں عربی و فارسی کا درس دیا"۔

غرض یہ کہ حقی صاحب کی جنم بھومی دہلی ہے اور ان کا تعلق دہلی کے ایک مشہور و معروف علمی خانوادے سے ہے۔ انھوں نے اپنے ان دونوں حوالوں کا پاس رکھا ہے اور ان حوالوں کو مزید معنویت بخشی ہے۔ دہلی جیسے شہرۂ آفاق شہر سے نسبت میرے نزدیک یقیناً ایک وجہِ افتخار ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں اور ہر اعتبار سے دہلی صدیوں سے برصغیر کی عظمتوں اور رفعتوں کی علامت ہے خصوصیت کے ساتھ اس علمی اور ادبی عظیم ورثے کے حوالے سے جس کا نقطۂ آغاز و عروج امیرِ خسرو دہلوی ٹھہرتے ہیں۔ یہ ورثہ ایک کہکشاں کی صورت آسمانِ علم و ادب پر صدیوں سے

روشن ہے جس میں نئے نئے آفتاب و مہتاب اور سیاروں ستاروں کا اضافہ ہوتا رہا ہے حقی صاحب بھی بیسویں صدی میں اس کہکشاں کا حصہ بنے اور ایک روشن سیارہ بن کر ابھرے ۔ اور اس کہکشاں میں گم نہیں ہوئے بلکہ اپنے علمی و ادبی خانوادے کے تفاخر کو انھوں نے چار چاند لگا دیے ۔ چنانچہ آنے والی نسلوں کے لیے ان کا نام زیادہ معتبر اور محترم حوالہ ہوگا۔

جنم بھومی اور ایک ممتاز علمی خانوادے سے نسبت ہی کی طرح ان کا سن پیدائش بھی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے قابل ذکر اور لائق توجہ بنتا ہے ۔ ۱۹۱۷ء انسانی تاریخ میں ایک ایسے انقلاب کا سال ہے جس نے اپنے عروج و زوال ، ہر دو اعتبار سے تاریخ انسانی پر ہمہ گیر اور غیر معمولی اثرات مرتب کیے ہیں ۔ انقلابِ اکتوبر کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری انقلابِ فرانس ۱۹۱۷ء سے بھی کہیں زیادہ رہی ہے ۔ اس انقلاب کے نظریے کی صدائے بازگشت کرۂ ارض کے چپے چپے میں سنائی دی اور یہ سلسلہ آج بھی سوویت یونین کے انہدام کے اسباب و علل پر گفتگو اور تفکر کی صورت میں جاری و ساری ہے۔ انقلابِ اکتوبر نے عالمی سیاسی اور اقتصادی زندگی پر جہاں اثرات مرتب کیے ، وہاں افکار و نظریات کی دنیا کو متاثر کیا اور افکار و نظریات میں انقلاب برپا کیا ۔ ادب نے بھی اس انقلاب کا اثر قبول کیا اور اردو ادب برصغیر میں سب سے زیادہ اثر قبول کرنے والا ادب کہا یا جاسکتا ہے ، جس کے اظہار کی ابتدا علامہ اقبال کی شاعری سے ہوتی ہے اور جس کا نقطۂ عروج ترقی پسند تحریک کی شکل میں ظہور پذیر ہوا جس نے برصغیر کی تمام اہم زبانوں کے ادب کو متاثر کیا اور تمام تر اصناف میں گراں قدر اضافے کا سرچشمہ ثابت ہوا۔

حقی صاحب نے پندرہ برس کی عمر سے ادب نویسی کی ابتدا کی ، یعنی ۱۹۳۲ء سے ان کی ادبی زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ان کے شعور و فکر کی تعمیر و تربیت میں جہاں ان کے گھریلو ماحول کا براہِ راست اثر تلاش کیا جاسکتا ہے ۔ ہم اس عہد کو

نظرانداز نہیں کر سکتے جس عہد میں ان کے شعور کا ارتقائی سفر شروع ہوا اور پروان چڑھا ۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" ۔ یہ کہاوت حقی صاحب پر اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح creative genius پر صادق آتی ہے ۔ حقی صاحب جیسے غیر معمولی تخلیق کار کا اپنے گرد و پیش ، عہد اور سماج سے غیر متعلق رہنا ممکن ہی نہیں ہر چند کہ وہ کبھی بھی کسی تحریک سے وابستہ نہیں رہے ، خواہ اس کی نوعیت سیاسی ، نیم سیاسی یا نظریاتی اور نیم نظریاتی ہو ، مگر وہ ہمیشہ اپنے عہد کے تقاضوں ، رجحانات ، رویوں اور فکری دھاروں سے صرف باخبر ہی نہیں رہے بلکہ وہ ان سے براہِ راست متاثر رہے ، مگر ان کی بڑائی یہ ہے کہ وہ کبھی کسی دھارے میں بہے نہیں بلکہ اس کے تھپیڑوں اور تموج کو اپنے اندر جذب کیا اور تخلیقی رویوں میں توازن اور میانہ روی قائم رکھی ۔ انھوں نے کبھی وہ سفر اختیار ہی نہیں کیا جس سے انھیں واپسی اختیار کرنا پڑی ہو ۔ ان کے ہم عصروں میں بہت سے اہم نام ایسے ہیں جنھوں نے اپنے تخلیقی اور فکری سفر کے دوران یا تو مراجعت اختیار کی یا کرنے کی ضرورت محسوس کی یا یہ صورتِ حال ان اکابرینِ ادب، کو پیش آئی جن کے ہاں جذباتیت اور انتہاپسندی نے کبھی جگہ پالی تھی ۔ حقی صاحب کو یہ مرحلہ کبھی درپیش نہیں آیا ۔ مجھے حقی صاحب میں فیض کی بہت سے مشابہتیں ملتی ہیں ان میں سے ایک قدرِ مشترک ان کی consistency ہے ۔ ان کے اسلوب کی سادگی اور لہجے کا دھیما پن ان کی نگارشات کی پہچان ہے اور خود ان کی اپنی پہچان بھی ہے ۔ بلند آہنگی کا ان کی شخصیت اور فن ، دونوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ۔

ان کی ادبی شخصیت اور فن کی کثیر الجہتی ایک بڑی حقیقت ہے ۔ یہ کہنا کہ حقی صاحب کے فن اور شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں اور بہت سے پہلو ہیں تو یہ کوئی رسمی بات نہیں ہوگی جو عام طور پر لوگوں کے لیے لکھ دی جاتی ہے ۔ حقی صاحب کا نثر و نظم ، ہر دو شعبہء ادب میں گراں قدر عطیہ (contribution)

ہے ۔ نثر میں انھوں نے تحقیق و تنقید کے علاوہ افسانہ نگاری کے میدان میں اپنے نقوش پا چھوڑے ہیں اور ادبی صحافت کے میدان میں بھی ۔

یوں تو حقی صاحب اپنی تمام تر ناوابستگیوں کے باوجود چالیس کی دہائی میں ایک جانی پہچانی ادبی شخصیت بن چکے تھے اور بیشتر حلقوں میں ان کے لیے احترام و اعتراف پایا جاتا تھا ، مگر ۱۹۵۲ء میں جب ان کے پہلے مجموعۂ کلام ' تارِ پیراہن ' کی پذیرائی جس پیمانے پر ہوئی اور ادبی حلقوں اور اکابرِ نقد و نظر کی طرف جو ردِ عمل سامنے آیا ، وہ کسی بھی قلم کار کے لیے وجہِ اطمینان اور باعثِ فخر کہا جاسکتا ہے ۔ جناب حقی صاحب کی دوسری تالیفاتِ نظم و نثر میں خیابانِ پاک ، شہیدِ حریت ، صورِ اسرافیل ، انتخابِ ظفر ، انجان راہی (ترجمہ : ناول) ، نکتۂ راز (منتخب مضامین) حرفِ دل رس (غزلیات) ، سہانے ترانے (بچوں کی نظمیں) ، درپن درپن (منظوم ترجمہ) نظمیں ، نذرِ خسرو (پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں) چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں ۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری مرحوم نے "نکتۂ راز" کے مضامین کے حوالے سے یہ رائے ظاہر کی تھی :

" نہ شان الحق حقی تعارف کے محتاج ہیں اور نہ ان کے مضامین کے پیشِ نظر مجموعے کو اس کی ضرورت ہے ۔

تُرکِ سیاہ چشم کو سرمہ فروش سے غرض ؟

نثر و نظم پر انھیں یکساں قدرت ہے اور دہلی مرحوم کے روز مرہ پر تو ان سے بہتر عبور اب کسی کو نہیں ۔ بایں ہمہ ان کے ذہن کو جدید علوم کی آنچ گرماتی ہے اور وہ جس موضوع کی طرف بھی توجہ دیں ، اسے منطق کے نور سے روشن کرتے اور حسنِ بیان کے پنکھے سے ہوا دیتے ہیں ۔ ان کے ادبی ذوق اور علمی شغف کا مجھے مدت سے اعتراف ہے " ۔

جناب حقی کی خلاقیت کو جن اکابرین ادب نے خراج تحسین پیش کیا، ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر ممتاز حسین، مولانا نیاز فتح پوری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ظ۔ انصاری، جوش ملیح آبادی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، سہیل عظیم آبادی کے علاوہ مشتاق یوسفی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، چودھری محمد علی ردولوی، خاطر غزنوی، مشفق خواجہ، مولانا صلاح الدین اور ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے ثقہ حضرات کے نام شامل فہرست ہیں۔ یہ فہرست ویسے خاصی بڑی ہے، اس فہرست میں اضافے کا عمل جاری رہے گا۔

حقی صاحب نے یوں تو نثر میں بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کے حوالوں سے بھی وہ ادب میں یاد رکھے جائیں گے، مگر شاعری میں ان کی خلاقیت کے جوہر کھلے ہیں اور خوب کھلے ہیں۔ شاعری میرے خیال میں حقی صاحب کی حقیقی شناخت بنتی ہے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"حقی نے غزلیں بھی کہیں ہیں اور چھوٹی بڑی نظمیں بھی لکھی ہیں اور ترجمے بھی کیے ہیں، لیکن ان سب میں ایک مزاج اور ایک فضا کار فرما نظر آتی ہے اور وہ ہے زبان و بیان کی قدرت اور جذبات و محسوسات کو دھیمے دھیمے لہجے میں ڈھالنے کی اہلیت۔ ان کے ہاں روایت اور جدت ایک دوسرے میں ضم ہو گئی ہیں۔ انھوں نے اساتذہ سے بھی فیض اٹھایا ہے اور جدید شعور سے بھی استفادہ کیا۔ انھیں ماضی کے تہذیبی شعور کا احساس ہے اور نئی تبدیلیوں اور محرکات کا بھی۔ وہ روایات کا دامن بھی تھامے ہوئے ہیں اور اسے حال و مستقبل کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور اس سے انحراف بھی کرتے ہیں۔ احساس کے اس تضاد سے ان کی شاعری کا خمیر اٹھتا ہے

مختلف اصنافِ سخن میں ان کی نگارشات اور تخلیقات میں ان کی انفرادی چھاپ ملتی ہے، مگر اس صدی کے بیشتر بڑے شاعروں کی طرح حقی صاحب کی شاعرانہ عظمت کی اساس ان کی غزل ہی ثابت ہوئی ہے"۔

اس ضمن میں مشفق خواجہ کی رائے سے اتفاق نہ کرنا ممکن نہیں:

"یہ بات بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہی جا سکتی ہے کہ حقی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بہترین اظہار غزل کے پیرائے میں ہوا ہے۔ وہ اس صنف کے فنی لوازمات سے پوری طرح واقف ہیں اور انھیں یہ بھی احساس ہے کہ یہ ذریعۂ اظہار خیالات کی بے ربطی کا آئینہ دار نہیں ہوتا بلکہ ایک مربوط اور مسلسل نظامِ فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ غزل میں محض منتشر شاعرانہ خیالات ہی نہیں ہوتے، بلکہ ان منتشر خیالات میں گہرا معنوی ربط پایا جاتا ہے جو زندگی کی بنیادی صداقتوں کو سمجھنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل زندگی اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے"۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ خالص ادب کے آدمی ہیں اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں وہ کسی تحریک سے وابستہ نہیں رہے اور کسی مخصوص نظریۂ ادب سے ان کو منسوب نہیں کیا جا سکتا، مگر مجموعی طور پر ان کا ادب میں رویہ اور کردار مثبت اقدار کی نمائندگی کرنے والے فن کار کا رہا ہے۔ وہ ادب کو محض تسکینِ ذات کا وسیلہ نہیں گردانتے اور حسن کاری کے لوازمات وہ زندگی سے حاصل کر کے زندگی کو بھی لوٹانے کے قائل ہیں۔ میں کسی غلو اور مبالغے سے کام لیتے ہوئے یہ نہیں کہوں گا کہ حقی صاحب عہد ساز اور رجحان ساز تخلیق کار ہیں اور وہ اپنے عہد پر اثر انداز ہوئے ہیں

مگر یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اپنے عہد کے ایسے ترجمان ٹھہرتے ہیں جن کے فن میں روحِ عصر کی کارفرمائی بدرجۂ اتم دیکھی جاسکتی ہے۔ زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے اور معاشرے کو خوب صورت تر دیکھنے کی آرزو ان کی شاعری اور فن کی قوتِ محرکہ رہی ہے۔ ان کے اسی جذبے کی وسعت اور پھیلاؤ میں انسان دوستی کی آفاقیت پائی جاتی ہے۔ ان کا شعور بنیادی طور پر اسی خمیر سے عبارت ہے۔ وہ بیسوی صدی کے شاعر ہیں اور اس صدی کی خصوصیات اور حسیت ان کے شعور کی اساس رہی ہیں۔ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے وہ اپنے ہم عصروں میں بلند تر منصب کا استحقاق رکھتے ہیں۔ وہ جدید و قدیم روایات اور اقدار کا سنگم ہیں اور ان کے شعر و فن میں روایت اور جدت، اجتماعِ ضدین کے طور پر نہیں ہیں بلکہ تہذیبی تسلسل اور ہم آہنگی کی بہترین ترجمانی کرتی ہیں۔ حقی صاحب واقعی باقیات الصالحات میں سے ہیں اور اپنی ذات میں ادب کا ایک قوسِ قزح ہیں جس کا مشاہدہ اور مطالعہ روشنیٔ طبع کو جِلا بخشتا ہے اور روح کو تازگی اور طمانیت بہم پہنچاتا ہے۔ ان کا شمار نایاب میں اگر نہیں کیا جاسکتا تو کم یاب شخصیات میں ضرور کیا جانا چاہیے۔

جون، ۱۹۹۳ء

# حبیب جالب

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا ، جالب!
چاروں جانب سناٹا ہے ، دیوانے یاد آتے ہیں

حبیب جالب کی غیر معمولی قبولیتِ عام اور پذیرائی ایک قابلِ رشک حقیقت ہے۔ یہ عمومی پذیرائی اور قبولیتِ عام انھیں زندگی میں حاصل رہی اور مرنے کے بعد بھی حاصل ہے۔ ان کی موت کی خبر پورے ملک ، بلکہ پوری اردو دنیا میں آگ کی طرح پھیلی اور ادبی فضا کو سوگوار کر گئی۔ ذرائع ابلاغ نے حبیب جالب کی وفات کی خبر بالتفصیل اور بروقت تشہیر کی جس کے لیے ان کے دروازے ایک عرصۂ دراز تک تقریباً بند رہے تھے۔ ملک اور بیرونِ ملک تعزیتی اجلاسوں کا سلسلہ خاصی دیر تک جاری رہا۔ رسائل اور جرائد نے حبیب جالب کے حوالے سے تاثرات اور جائزے بھی پیش کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ ماہ نامہ جفاکش کراچی نے اپنا اپریل ۹۳ء کا شمارہ حبیب جالب نمبر کے طور پر شائع کیا۔ اس شمارے میں ایک درجن سے زائد تاثراتی مضامین اور یادداشتیں شائع کی گئی ہیں جن سے ان کی ادبی شخصیت اور ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ

کچھ مختصر تاثرات بھی شاملِ اشاعت ہیں جن میں جناب احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، حمایت علی شاعراور قتیل شفائی کے تعزیتی تاثرات بھی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ قاسمی صاحب نے کہا کہ حبیب جالب بلاشبہ اپنے عہد کا نمایاں اور نمائندہ شاعر تھا۔ قتیل شفائی کے لفظوں میں حبیب جالب ایک شاعر ہی نہیں، وہ ایسا انسٹی ٹیوشن تھا جو اس کی ذات پر مشتمل تھا۔ جالب نے جس بے باکی سے اپنے گرد و پیش پر تنقید کی،اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ لوگوں نے فیشن کے طور پر مزاحمتی شاعری کی اور جالب نے اسے مشن بنائے رکھا۔ احمد فراز نے سچ کہا کہ جالب کبھی نہیں مر سکتا۔ بس یہ کہ وہ خاموش ہو گیا ہے، مگر اس کی باتیں زندہ ہیں، اس کا کلام زندہ ہے، اس کی سوچ زندہ ہے۔ شاملِ اشاعت مضامین کو لکھنے والوں میں سرِ فہرست نام مرحوم سبطِ حسن کا ہے۔ عوامی شاعر حبیب جالب کے زیرِ عنوان اس مضمون کے ابتدائی سطور میں کہا گیا ہے کہ اردو زبان نے نظیر اکبر آبادی کے بعد اگر سچ مچ کوئی عوامی شاعر پیدا کیا ہے تو وہ حبیب جالب ہے۔ میرے خیال میں مرحوم سبطِ حسن کے یہ الفاظ حبیب جالب کی عظمت کا ایک بڑا غیر مبہم اعتراف ہے۔ دوسرے اہلِ قلم جنھوں نے اس شمارے میں حبیب جالب کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے خراجِ تحسین پیش کیا اور اس کی شعری عظمت، شخصیت اور بصیرت کا جائزہ پیش کیا ہے، ان میں زاہدہ حنا، سعیدہ گزدر، محمد خالد اختر، مرحوم قسور گردیزی، علی سفیان آفاقی، مجاہد بریلوی، سرفراز سید، حامد میر، فردوس حیدر، سعید پرویز اور حسن رضوی شامل ہیں۔ منظوم خراجِ تحسین پیش کرنے والوں میں مرحوم افضل صدیقی، توقیر چغتائی بابا نجمی اور ریاض تسنیم کی نگارشات بھی متاثر کن ہیں۔ حبیب جالب جیسے عظیم شاعر کی یہ قدر و منزلت اس کا حق ہے۔ معاشرے کے لیے جالب نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، لہٰذا معاشرے کا یہ فرض بنتا ہے کہ اس کا اعتراف بطریقِ احسن کرے اور اس کو اپنی آنکھوں میں جگہ دے۔ جالب عوام کا شاعر تھا، عوام کا محبوب شاعر تھا۔ وہ

عوام کے دکھوں، مصائب و آلام اور تکلیف کو محسوس کرنے والا اور انھیں بلاخوف و خطر اپنے توانا لہجے میں بیان کرنے والا شاعر تھا۔ ماہ نامۂ جفاکش کی پہل کاری لائقِ تحسین بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔

یوں تو وقتاً فوقتاً جالب کی زندگی میں بھی ان پر مضامین لکھے گئے اور ان کی جرأتِ اظہار کے ساتھ ساتھ ان کے شاعرانہ منصب کے حوالے سے گفتگو کی گئی، جالب کی قبولیتِ عام (mass appeal) کے حوالے سے فیض صاحب کا یہ جملہ نہایت وقیع خراجِ تحسین ہے کہ "اردو شعرا میں جتنے سامعین جالب کو میسر آئے، اور کسی کو نہ آسکے"، مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اربابِ نقد و نظر نے حبیب جالب کی شاعری کو یا تو نظر انداز کرنے کی روش اپنائی یا پھر تعصب سے کام لیا۔ ناقدین کے اس رویے کا خود حبیب جالب کو بھرپور احساس تھا، چنانچہ اس کا یہ ردِ عمل کہ "میں نقادوں کا نہیں، عوام کا شاعر ہوں"، صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ ترجمان ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اپنے عہد کے فرق کے ساتھ نظیر اکبر آبادی اور حبیب جالب کو ناقدین کی طرف سے ملتے جلتے رویے کا سامنا رہا۔ نظیر اکبر آبادی کو جس طرح ایک عرصۂ دراز کے بعد اس منصب اور عظمت کا حق دار ٹھہرایا گیا جس کے وہ مستحق تھے، اس طرح حبیب جالب کے سلسلے میں بھی ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اربابِ نقد و نظر کو آج نہیں تو کل کرنا ہی پڑے گا جس کی ابتدا کتابی سلسلے "ارتقا" کے گوشۂ جالب سے ہو گئی ہے۔ یہ گراں قدر گوشہ "ارتقا" کے سلسلہ نمبر ۱۱ میں شائع ہوا ہے اور جس میں بیشتر مضامین اور مقالات نہایت ثقہ ناقدوں اور ادیبوں کے ہیں۔ ان تمام تحریروں میں جالب کی شاعرانہ حیثیت کی صحیح تصویر کشی کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی شاعری کی ان خصوصیات پر بڑی دیانت داری سے روشنی ڈالی گئی ہے جو جالب کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہیں اور جن سے جالب کی انفرادیت کی نشان دہی ہوتی ہے۔ مذکورہ گوشۂ جالب ،، صفحات پر مشتمل ہے

اس گوشے کے شرکا میں ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ڈاکٹر محمد علی صدیقی ، جناب احمد ہمدانی جناب حسن عابدی ، جناب سہراب اسلم شامل ہیں ۔ آخر الذکر کے علاوہ سب ہی نام نہایت محترم اور معتبر ہیں جن کی تنقیدی بصیرت مسلم ہے ۔ ان تمام صاحبان نقد و نظر نے جالب کی شاعری کو موضوع بحث بنایا ہے اور بڑی سنجیدگی سے اپنی آرا پیش کی ہیں جن کی روشنی میں یہ رائے قائم کرنا کہ جالب ایک غیر معمولی شاعر ہے اور اس کی خلاقیت کی اپنی ایسی سرحدیں ہیں جہاں شاید ہی کوئی دوسرا نظر آئے ، کوئی مشکل بات نہیں ۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں :

"کوئی بیس ، پچیس سال ادھر کی بات ہے ۔ لاہور کی ادبی محفلوں میں ایک نوجوان باقاعدگی سے شریک ہوتا ، مشاعروں میں لہک لہک کر اپنا کلام پڑھتا اور سننے والوں کو اپنے کلام اور اپنے لحن سے مسحور کر دیتا تھا ۔ اس کی باتوں میں بھی مسحور کر دینے والی کیفیت تھی ۔ جوش اور جذبے سے بات کرتا لیکن اس کی باتیں پوری طرح واضح نہیں ہوتیں ، البتہ یہ احساس ضرور ہوتا کہ اس کی باتیں دل سے نکلی ہوئی ہیں اور جو کچھ کہہ رہا ہے ، اس میں صداقت اور خلوص کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ۔ یہ نوجوان حبیب جالب تھا" ۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی یہ تحریر جالب کی زندگی میں لکھی گئی تھی ۔ جالب کی شاعری اور شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیات اگر گنوائی جائیں تو خلوص اور صداقت سرفہرست ہوں گی ۔ ان ہی دو اوصاف سے اس کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے اور ان ہی سے اس کی شخصیت عبارت ہے ۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جالب کی شاعرانہ زندگی کے ابتدائی دور کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی شاعری کے ارتقائی سفر کا جائزہ پیش کرتے لکھا :

"یہ زمانہ حبیب جالب کی شاعری کے لیے بھی بہت مفید اور بار آور ثابت ہوا۔ اس زمانے میں اس نے جو غزلیں تخلیق کیں، ان میں ایک احساس تھا، زندگی کو جاننے اور حالات کو پہچاننے کا ایک نیا شعور تھا۔ زمانے کی مزاج دانی اور ماحول کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی خواہش اس میں کچھ زیادہ نمایاں تھی اور اس صورتِ حال نے حبیب جالب کو صداقت کا ترجمان، خلوص کا عکاس اور حقائق کا نباض بنا دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ خصوصیات حبیب جالب کے کلام میں اس سے قبل موجود نہیں تھیں۔ ایسا نہیں ہے، لیکن اب اس کے شعور پر خاصی جِلا ہو گئی اور نظریے کی پختگی کا احساس اس کے یہاں زیادہ نمایاں ہونے لگا، اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ کلاسیکی رنگ جس پر اس کی شاعری کی بنیاد استوار تھی، وہ اس کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ گہرا ہوتا گیا اور یہ سب اس کے کلام کی ایسی خصوصیات ہیں جو اس کی دل کش اور دل نشین شاعری میں آج بھی نمایاں ہیں اور ہمیشہ نمایاں رہیں گی۔"

جالب کی شخصیت اور شاعری میں اس کا آدرش اور مسلک غالب عنصر رہا ہے ڈاکٹر عبادت نے اس پہلو کا ذکر کیا اور اس ضمن میں اس کی موثر شاعری کا اعتراف کیا۔

وہ لکھتے ہیں:

"حبیب جالب نظریے کا شاعر ہے، اس لیے کہ وہ نظریے کا انسان ہے۔ زندگی کی قدریں اسے بے حد عزیز ہیں۔ وہ بے قاعدگی، ظلم، ناانصافی، تعیش پسندی، اخلاقی پستی اور سماجی ناہمواریوں کا دشمن ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر میں ہر اس شخص کے

ساتھ ہوجاتا ہے جو ان قدروں کو ساتھ لے کر چلتا ہے ۔ لیکن جہاں ان قدروں سے ان کا دامن چھوٹتا ہے، حبیب جالب اس سے علیحدگی اختیار کرلیتا ہے اور اپنے فکر و فن کے نشتروں سے اس کے بخیے ادھیڑ دیتا ہے"۔

ڈاکٹر عبادت نے اپنے اس مضمون میں جالب شناسی کی جانب بڑی اہم رہنمائی کی ہے۔

"حبیب جالب ایک عوامی شاعر"، یہ عنوان اس مضمون کا ہے جو "گوشۂ جالب" میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے لکھا ہے ۔ اس کا ابتدائی فقرہ "حبیب جالب (۱۹۲۸ء ۔ ۔ مارچ، ۱۹۹۳ء) ہم عصر شعرا میں منفرد و ممتاز حیثیت کے مالک تھے"، جالب کی شاعرانہ عظمت کا واضح اعتراف ہے اور یہ رائے ہمارے عہد کے ایک معتبر نقاد کی ہے ۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ حسرت موہانی جالب کے ہیرو تھے اور ان کے خیال میں حسرت موہانی یقینی طور پر حبیب جالب شناسی کے لیے ضروری حوالہ ہیں اور اس لیے "حرفِ سردار" میں شامل حبیب جالب کا خراجِ عقیدت "نذرِ حسرت موہانی" ایک سلسلۂ معنوی اور سیاسی کے ساتھ ہم رشتگی کا اعلان ہے ۔ ان کی رائے میں جالب قیامِ پاکستان کے بعد آزادی جیسی مقدس قدر کی پامالی پر جس طرح چیں بہ جبیں ہوئے اور اپنی سیاست اور صدائے احتجاج کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں، وہ سب حسرت موہانی ہی کی سیاسی روش پر گام زن ہونے کا منطقی نتیجہ ہے ۔ جالب کے نظریۂ شاعری کے حوالے سے یہ بات بڑی درست ہے کہ شاعری صرف حسن و عشق کے جذبات کی مرقع نگاری یا کش مکش زیست کی ترجمانی یا باطنی واردات کے بیان میں تملق کا مظاہرہ نہیں، بلکہ شاعری زندگی کی کلیت تک رسائی کا نام ہے ۔ جالب ۱۹۶۰ء سے عوامی شاعر بنے جب انھوں نے ایوب خان کی آمریت کو للکارا ۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۳ء تک وہ ایک ایسے شاعر کے روپ میں جلوہ گر نظر

آتے ہیں جو ملک کی سماجی اور سیاسی صورتِ حال پر بے ریا ردِ عمل پیش کرتا ہے
مضمون کے آخری سطور کا یہ فقرہ کہ "جالب ہمارے شعور کی آبیاری کے لیے سماجی
اور سیاسی مورخ بن گئے"، جالب کے پورے شعری سفر اور شعوری سفر پر بہترین
تبصرہ اور خراجِ تحسین ہے۔ جالب کی شاعری میں گزشتہ تین دہائیوں کی قومی، سماجی
سیاسی اور اقتصادی زندگی کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسا
آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنا سماج نشیب و فراز سے گزرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت
ہے کہ یہ سفر بیشتر دکھوں کا سفر ہے، مگر جالب نے مسافرانِ محبت کا حوصلہ کبھی
پست نہیں ہونے دیا اور تمام زندگی بھرپور اعتماد کا فانوس جلائے رکھا۔

"گوشۂ جالب" کا سب سے اہم اور جامع مضمون "جالب .... بے چین روح
کی آواز" کے زیرِ عنوان ہے اور صاحبِ مضمون ہیں جناب احمد ہمدانی۔ اس مضمون
میں جالب کی شاعری کے محرکات سے لے کر اس کے محاسن کا نہایت خوب صورت
جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مضمون کا آغاز ان سطور سے کیا گیا ہے:

"حبیب جالب کی شاعری ایک بے چین روح کی آواز ہے۔
ایک ایسی بے چین روح کی آواز جو ہر لمحے بدلتی کائنات کے سروں
سے سر ملانے میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ بدلتی کائنات
کے سروں سے سر ملانا زمانے سے ساز باز کر لینے یا ابن الوقتی کی
روش اختیار کر لینے سے مختلف عمل ہے اور نہ صرف مختلف بلکہ
متضاد ہے۔ جہانِ متغیر کے سروں کو ملانے کے لیے ضروری ہے کہ
انسان تغیراتِ جہاں کی روح کو اپنی روح میں سمو لے اور پھر ذات و
کائنات کے مابین تمام فاصلوں کو مٹا کر ہم آہنگی کی فضا پیدا کرے
حبیب جالب کی شاعری کا پورا سفر اس کی ذات اور کائنات کے مابین
ہم آہنگی کی تلاش ہے۔"

انھوں نے ان کے متعدد شعری حوالوں سے حبیب جالب کی مضطرب و متحرک شخصیت کی نشان دہی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا شوق آوارگی اس کے خمیر میں شامل ہے۔ اس شوق آوارگی کی بدولت جالب اپنی شاعری میں ایک مسلسل حرکت کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں ٹھس اور جامد مصرعوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے مصرعے اس کے خیال کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آگے بڑھنے کا یہ عمل کبھی الفاظ اور بحور کے فن کارانہ استعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی متحرک تمثیلوں اور استعاروں سے پیدا ہوتا ہے۔ جالب کے یہاں لفظ آوارہ کا مسلسل استعمال اور کیفیتِ آوارگی کا متواتر اظہار یونہی کچھ اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ اس کی باطنی کیفیت کا اظہار ہے۔ جالب کی وارفتگی و آشفتہ سری کبھی اپنا ناتا روحِ تغیر سے منقطع نہیں ہونے دیتی جس کی وجہ سے اس کے اشعار میں نغمگی کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ نغمگی کبھی بہت نمایاں ہوتی ہے اور کبھی سمندر کی گہرائیوں میں موجود موج کی طرح سخن زیرِلب کا انداز اختیار کیے رہتی ہے۔ ہمدانی صاحب نے نغمگی اور موسیقیت کو جالب کی شاعری کی جان کہا ہے اور یہ اوصاف اس کی غزلوں کے علاوہ اس کی مشہور ایسی ہی نظموں میں دکھائے گئے ہیں۔ جالب کی متعدد نظموں اور غزلوں کی مثالیں دے کر ہمدانی صاحب نے کہا کہ اس کی ایسی نظمیں بھی جو سراسر واقعاتی ہوتی ہیں، شعریت سے خالی نہیں ہوتیں۔ دراصل جالب کی محبت کا دائرہ اپنی ذات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا پیار پوری زندگی پر محیط ہے۔ زندگی سے اس پیار کی خاطر وہ زندگی کے خارزاروں میں پھول کھلانے کی کوشش میں منہمک رہا۔

حسن عابدی صاحب کے مضمون کا عنوان ہے "جالب .... روشن دنوں کی بشارت"۔ اس مضمون میں عابدی صاحب کے مطابق جالب کے یہاں دیوانگی مکمل تھی۔ یہ دیوانگی جالب کے یہاں توانائی اور حرکت کی اساس ہے اور اس کے

خلوص فکر و نظر کا سرچشمہ ہے ۔ فرزانگی اور مصلحت کوشی اس کے بس کی بات نہیں تھی ۔ اس کی شخصیت اور شاعری میں کوئی بعد اور تضاد نہیں ہے ۔ اس حوالے سے بھی جالب اور مولانا حسرت موہانی میں مماثلت پائی جاتی ہے ۔ عابدی صاحب نے جالب کی بعض زبان زدِ خاص و عام نظموں کی نشان دہی کرتے ہوئے بجا طور پر کہا کہ جالب کا کمال فن یہ ہے کہ نعرہ اس کے یہاں شعر بن گیا ہے ۔ یہ سب کچھ اس کے خلوص اور اپنے آدرش سے والہانہ لگاؤ کا ثمر ہے ۔ عابدی صاحب کے لفظوں میں "جالب کی شاعری کو وقتی اور لمحاتی قرار دینے والے نقاد بھی اس کے سحر سے انکار نہ کر سکے ، کیونکہ اس کی شاعری میں وہ صداقت ہے جو اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی ۔ جالب کی آواز ہمارے دور کی آواز ہے اور تاریخ کا حصہ ہے" ۔

"گوشۂ جالب" کا سب سے طویل اور مفصل مضمون سہراب اسلم کا تحریر کردہ ہے ۔ یہ مضمون جالب سے صاحبِ مضمون کی ۱۹۵۹ء میں ایک دلچسپ ملاقات کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد کے پورے عرصے پر پھیلی ہوئی یادیں اور باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ یادوں کے اعادے کے علاوہ جالب کے شعری اور شعوری سفر کا اس مضمون میں بڑی ہنرمندی سے احاطہ کیا گیا ہے اور جالب کی شاعری کے محاسن و خصوصیات اور حرکات کا بڑا پراسرار اور دلچسپ اظہار ہے ۔ ملک کی جمہوری تحریک میں جالب کی شاعری کے کردار پر خصوصی توجہ دی گئی ہے ۔ وطن دوستی اور سامراج دشمنی کی لہریں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں ۔ جمہوری تحریک کے ہمدردوں سے کہا گیا ہے کہ "جالب کی نظموں نے تحریکِ بحالی جمہوریت کو بار آور کرنے میں وہی کردار ادا کیا جو روسی مصنف میکسم گورکی کے عہد ساز ناول "ماں" نے روسی انقلاب کے سلسلے میں ادا کیا تھا یا پھر مایاکوفسکی کی شاعری نے" ۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے مضمون میں فیض اور جالب کا ذکر کرتے ہوئے بڑی درست رائے کا اظہار کیا تھا کہ جالب فیض کے قبیلے کے شاعر نہیں ہیں ، لیکن

فیض جالب سے پیار کرتے تھے۔ سہراب اسلم نے فیض و جالب کا تذکرہ کچھ زیادہ سنجیدگی سے کیا ہے جو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

وہ لکھتے ہیں:

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ فیض اور جالب کی شاعری کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ دونوں اردو کے شاعر ہیں، دونوں کا تعلق پاکستان سے ہے، لیکن جالب کے حصے میں وہ بین الاقوامی شہرت نہ آئی جو فیض کو نصیب ہوئی۔ معترضین کی بات بے وزن نہیں ہے، لیکن وہ یہ سوچتے کہ ان دونوں ترقی پسند شاعروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فیض نے اشاروں کی زبان میں شاعری کی ہے، جبکہ جالب نے یہی کام عوام کی زبان میں کیا ہے۔ فیض نے پڑھے لکھوں کے لیے شاعری کی جبکہ جالب نے ان پڑھوں سے بھی داد وصول کی ہے ایک غالب کا مقلد ہے دوسرا نظیر اکبر آبادی کا۔ ایک ہزاروں کا شاعر ہے دوسرا کروڑوں کا، ایک دانش وروں کا شاعر ہے دوسرا عوام کا۔"

ایک اور مرحلے پر یہ ذکر کسی اور عنوان اور انداز سے آیا ہے۔ سہراب اسلم کے لفظوں میں "فیض کا بیشتر اچھا کلام جیل کے زمانے کا ہے اور جالب کا اچھا کلام جیل سے باہر کا ہے کہ وہ جیل اس وقت بھیجے جاتے جب حکومتِ وقت کو ان کی سیاسی شاعری تنگ کرنے لگتی تھی اور حکومت خطرہ محسوس کرنی لگتی کہ اگر جالب کو باہر رہنے دیا گیا تو راج سنگھاسن ڈول جائے گا، عوام سڑکوں پر آجائیں گے اور صورتِ حال قابو سے باہر ہوجائے گی۔ بہرحال اس آنکھ مچولی نے پاکستانی ادب اور سیاست پر ایک احسان کیا ہے۔ فیض کی صورت میں پاکستان کو پاکستان کا پابلو نرودا اور جالب کی صورت میں مایا کوفسکی"۔

ہر چند کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور سہراب اسلم نے فیض و جالب کے حوالے

سے جو باتیں کہی ہیں، وہ نادرست نہیں ہیں مگر میری رائے میں یہ موازنہ بنیادی طور پر غیر ضروری ہے۔ اس موازنے کے نتیجے میں ہم دونوں میں سے کسی سے انصاف نہیں کرپاتے بلکہ دونوں کے لیے ایک embrassment کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ وہ فیض کے قبیلے کا شاعر نہیں ہے تو پھر دیگر فروعی باتوں کے ذکر سے کیا حاصل؟ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جالب کی ذات اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اپنی دنیا آپ ہے۔ اس کی شاعری کی اہمیت اور افادیت کی سرحدیں اپنی آپ ہیں۔

بیسویں صدی کے شعرا میں جن کے ہاں احتجاج نمایاں وصفِ سخن ہے، ان شعرا میں میرے نزدیک سب سے اہم نام حبیب جالب کا ہے۔ حبیب جالب کے شاعرانہ منصب کا تعین کرنے کے لیے عام معیار سے ہٹنا پڑے گا، ادب کے سماجی کردار کے نظریے کی صحت کے حوالے سے جالب کی شاعری کو پرکھنا ہوگا۔ جالب کے معترضین دراصل اس شعری نظریے کے معترض اور مخالف ہیں، جن کے نزدیک سماجی مسائل اور سماجی موضوعات سرے سے غیرِادب اور غیرِشعر ٹھہرتے ہیں، جن کے خیال میں شاعری میں پیغام کا ہونا ضروری نہیں بلکہ عیبِ شعر ہے۔ جالب اس قبیلے کے شاعر اور ادیب ہیں جو ادب کے ذریعے سماجی زندگی کی بدصورتیوں کے خلاف نبرد آزمائی کے قائل ہیں اور سماج کو استحصال اور ناانصافیوں سے نجات دلانے کے لیے اور انسانیت کو طرح طرح کی زنجیروں اور جوئے کی گرفت سے آزاد کرنے کے لیے شاعری کو ایک وسیلہ جانتے ہیں۔ وہ ادب کو vehicle of change سمجھتے ہیں اور سماج کو بدلنے کا موثر ذریعہ جانتے ہیں۔ جالب نے ساری عمر اپنے اس آدرش کی پاس داری کی اور اپنے سماج اور انسانیت کے لیے سب کچھ کیا جو اس کے دائرۂ اختیار میں تھا۔ جن معیارات پر جالب کی شاعری کو مسترد کیا جاسکتا ہے، ان پر اردو کے بیشتر بڑے شعرا کی نگارشات بھی پوری نہیں اتریں گی اور اس

طرح وہ بھی مسترد کیے جانے کے دائرے میں آجائیں گی جن میں خاص طور پر علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کی شاعری کا بیشتر حصہ شامل ہوگا؛ کیونکہ ان میں بھرپور ابلاغ بھی ہے، سپاٹ پن کی تہمت بھی لگائی جاسکتی ہے، یک رخا پن اور اکہرے پن کے الزامات بھی عائد کیے جاسکتے ہیں اور اسے منظوم نثر (versifcation) کے خانے میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اگر میرے ان اکابرین کی شاعری کا بیشتر حصہ غیرِ ادب اور غیرِ شعر ٹھہرتا ہے تو پھر اردو شاعری کی کیا پونجی باقی رہے گی، یہ غور طلب مرحلہ ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں احتجاجی شاعری، انقلابی شاعری، مزاحمتی شاعری اور عوامی شاعری جیسی اصطلاحات کے حوالے سے جو ابواب تحریر کیے جائیں گے، جالب کا نام ہر جگہ ان کی زینت ہوگا۔ اس کی مشہور نظمیں دراصل مختلف عشروں کی سماجی اور سیاسی زندگی کی بہترین تصویریں اور تفسیریں ہیں۔ اس کی مشہور ترین نظم "دستور" ساٹھ کی دہائی پر محیط ہے، "لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو" ستر کی دہائی کی یاد دلاتی ہے اور جمہوری روایات اور اداروں کی جو بے توقیری ہوئی ہے، اس کی ایک داستان اس نظم کے بین السطور میں محفوظ ہے۔ "ظلمت کو ضیا" اسی (۸۰) کے عشرے کی کہانی ہے۔ ان نظموں میں سچائی کا حسن بھی جلوہ گر ہے اور حق گوئی کی معجز بیانی بھی۔ جذبہ و خلوص کی ایسی گرمی ان نظموں کے حرف حرف میں سرائیت کیے ہوئے ہے کہ یہ نظمیں ہنگامی اور لمحاتی ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ محفوظ رہیں گی اور جراتِ فکر و نظر کی شہادت کے طور پر ہمیشہ بہترین حوالہ ٹھہریں گی۔ ان نظموں کے علاوہ جالب کی تمام مشہور نظمیں اپنی توانائی اور اثر انگیزی کے اعتبار سے ناقابل فراموش رہیں گی۔ ان نظموں نے جس طرح اپنے عصر کو متاثر کیا، یہ نظمیں اس وقت تک اپنی اثرانگیزی اور افادیت کا جادو جگاتی رہیں گی جب تک سماج میں جبر و جہل کی عمل داری رہے گی، استحصال جاری رہے گا اور ظلم و ستم انسان کا مقدر

رہے گا۔ جالب کی نظمیں زندگی کی حرارت اور حرکت کی ترجمان ہیں ۔ جالب کی شاعری کے سرچشمے زندگی کے سرچشمے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایسے کتنے شعرا ہیں جو ایک ایک ، دو دو شعر کے حوالے سے زندہ ہیں ۔ جالب ان میں سے ہیں جن کی متعدد نظمیں زبان زدِ خاص و عام ہیں اور جالب کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی نکل آئے گی جو کسی شاعر کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی ضامن ٹھہرتے ہیں۔ مثلاً:

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

○○○

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے ، داستاں چھوڑ آئے

جولائی اگست ، ۱۹۹۳ء

# حمایت علی شاعر

ایک میں ہوں جس کو تم مانتے نہیں شاعر
اور ایک میں ہوں تم میں نکتہ داں ، یارو!

"طلوعِ افکار" نے اپنے نئے سفر کا آغاز جنوری ، ۱۹۸۸ء سے اپنے اس مسلک کے اظہار سے کیا تھا کہ

"ہماری ترجیحات ادب سے شروع ہو کر ادب پر اختتام پذیر ہوں گی۔ اس سے ہماری مراد ادب کی خود مختاری کے نظریے کی ترویج نہیں بلکہ ادب اور زندگی ، ادب اور سماج کے رشتوں کو نئی وسعتوں اور نئے امکانات سے ہم کنار کرنے کے عزم کا اظہار ہے اور ادب کے سماجی کردار اور منصب کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی آرزو کا اعادہ ہے۔ ہمارے نزدیک ادب سماجی تبدیلی کا موثر ذریعہ ہے اور صرف کمٹمنٹ (commitment) ہی ہمارے وجود کو انسان اور ادیب کی حیثیت سے مستند کرتا ہے۔ فنی تخلیق اگر زندگی کے مسائل اور احترام سے مبرا ہو اور ایسے تصورات کی اشاعت کرے جو انسانی فلاح

اور ترقی کے دروازے بند کر دے تو وہ زندگی سے اور فن کی اعلیٰ
قدروں سے عاری اور بے مقصد ہوتی ہے۔ سماجی شعور سے عاری
ادب اور فنون لطیفہ کے تمام تصورات نہ صرف غیر ذمے دارانہ ہیں،
بلکہ ایسے تمام رجحانات اور تصورات انسانی تمدن اور تاریخ کی غلط
تاویل کا نتیجہ ہیں۔ ادیب و دانش ور اور فن کار معاشرے کا ضمیر اور
سماج کے زیادہ حساس اور باشعور عناصر ہوتے ہیں، اس لیے اپنی
تخلیقات کے ذریعے اپنے معاشرے کی بہتری اور ترقی میں مدد دینا ہمارا
سماجی اور اخلاقی فرض ہے۔ ہم قنوطیت، انفعالیت، قدامت پرستی،
مقدر پرستی اور زندگی کو فریب محض سمجھنے کے تصورات کو ادب کے
لیے پیغام مرگ سمجھتے ہیں۔ ادب کی زندگی کو تابندہ تر بنانے کے لیے
ان کی نفی کرنا ہماری ایک اہم ذمے داری بنتی ہے۔ ابلاغ سے محروم
نام نہاد تخلیقات خود ادب کو بے معنویت اور لایعنیت کا شکار کرتی
ہیں"۔

گویا زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کی روایات کو آگے بڑھانا ہم نے اپنا مسلک گردانا
تھا سو اس پر ہم قائم ہیں، زندہ دوستی ان میں روایات کا جزو لاینفک ہے۔ اس سلسلے کا
پہلا شمارہ پروفیسر ممتاز حسین کا گوشہ تھا جو اس وقت حیات تھے بلکہ بہت بعد تک
زندہ رہے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی ہم نے ان کا ایک گوشہ شائع کیا تھا۔ وہ واحد
شخصیت ہیں جن کے دو گوشے ہمارے جریدے میں اب تک شائع ہوئے۔ ہم ان
اکابرین کے لیے بھی گوشے بھی شائع کرتے رہے ہیں جو مرحومین میں شامل ہیں مگر
ہماری ترجیحات میں زندہ ادبا و شعرا کو فوقیت حاصل ہے اور اب تک بیشتر گوشے
ہمارے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں، چنانچہ زیر نظر شمارہ حمایت علی شاعر کے گوشے
پر مشتمل ہے۔ اس گوشے کو پیش کرتے وقت ہمیں اپنا مسلک بھی یاد ہے اور اپنی

ترجیحات بھی اور اپنا سرنامہ "خرد افروزی کا نمائندہ" بھی پیش نگاہ ہے۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے حمایت علی شاعر کا گوشہ شائع کر کے اپنے مسلک و ترجیحات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ وہ بلاشبہ آج ترقی پسند شعرا کی دوسری نسل کی فہرست کے ایک ممتاز اور نمایاں نام ہیں۔ وہ اس منصب پر ایک عرصے سے فائز ہیں جس کا اعتراف (Acknowledgement) برملا ہونا چاہیے۔ وہ اس گوشے کے مستحق ہیں، چنانچہ ہم ان کے اس استحقاق کا احترام کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہے ہیں۔

حمایت علی شاعر کی شاعری میں جہاں ان کی خلاقیت (creative genius) کے مظاہر نظر آتے ہیں، وہاں ان کے علم و فضل کی پرچھائیاں بھی نمایاں نظر آتی ہیں، موصوف نے ایک وقیع شعری اثاثے کے علاوہ خاصا بڑا نثری سرمایہ بھی ادب کے قارئین کو مہیا کیا ہے۔ ان کی دو کتابیں "شخص و عکس" اور "شیخ ایاز کی قدر و قیمت" ہرگز ناقابل اعتنا نہیں ہیں، مگر تاریخ ادب میں ان کا منصب و مقام شاعری کے حوالے سے ہی متعین ہو گا اور ان کی پہچان ان کی شاعری ٹھہرے گی۔ ان کی شاعری میں شدتِ جذبہ و احساس کے ساتھ فکر و نظر کی وسعت اور تنوع ان کی شعری خصوصیات میں وصفِ خاص کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ ایک صاحبِ نظر اور صاحبِ فکر شاعر ہیں۔ ان کا شعری سفر کسی مرحلے میں اندھیرے کا سفر نہیں رہا، بلکہ شعور کی روشنی کا سفر رہا ہے چنانچہ وہ ہمیں کبھی بھٹکتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے بلکہ ہر دور میں بڑے اعتماد کے ساتھ سفر تخلیق طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سماجی شعور اور عصری آگہی ان کے طرزِ احساس کی اساس اور ان کی حسیت (sensibility) کا سرچشمہ رہی ہے۔ ان کے ہاں روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ وہ ان رویوں، دھاروں اور رجحانات سے مرعوب نہیں ہوتے جو وقتی طور پر سکۂ رائج الوقت کے طور پر ادب کی قلم رو میں دکھائی دیتے ہیں، چنانچہ "حرف حرف روشنی" کے

"حرفِ مختصر" میں حمایت علی شاعر کا یہ اظہار اس ضمن میں قابلِ توجہ ہے:

"اسلوب کی انفرادیت اہم ضرور ہوتی ہے مگر اس حد تک نہیں کہ اس کی تلاش میں شاعری کا سفر گردِ سفر میں گم ہو کر رہ جائے اور شعری معنوی رشتہ اپنے عہد سے کٹ جائے۔ میرے نزدیک شاعری زندگی کے تنقیدی ادراک سے بھی عبارت ہے اور اس ادراک کے سوتے تاریخ و تہذیب کے جدلیاتی عمل اور اس کے نتائج میں اپنے عہد کے سائنٹفک تجزیے سے پھوٹتے ہیں اور شاعر اس آگہی کا ابلاغ شعر کی زبان میں فراہم کرتا ہے۔ علامت اور استعارہ اس ابلاغ کے وسیلے ہیں۔ اگر یہ وسیلہ اس قدر ذاتی اور داخلی ہو جائے کہ اپنے آئینے میں اپنی ہی شکل پہچانی نہ جاسکے تو شاعری بے چہرہ رہ جاتی ہے۔ ہمارے دور میں جدیدیت ایک ایسے ہی المیے سے دوچار ہے"۔

انھوں نے محض قبولیتِ عام کی خاطر Popular Notions کو اپنے یہاں جگہ نہیں دی، بلکہ وہ ہر رویے اور phenomenon کو تعقل پسندی کی کسوٹی پر پرکھنے اور rationalise کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں رد و قبول کا یہی معیار نظر آتا ہے وہ ایک جانے پہچانے ترقی پسند قلم کار ہیں۔ انھوں نے اپنی اس نظریاتی وابستگی اور کمٹمنٹ کو کبھی چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ ایک پرجوش leftist activist رہے۔ ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی بلند آہنگی اور پرجوش لہجہ نظر آتا ہے جو اس وقت ترقی پسند حلقوں کا شیوۂ عام تھا جن میں شدت اور انتہا پسندی کا عنصر نمایاں تھا، یہی وجہ ہے کہ موصوف نے بائیں بازو کے دانش ور اور ترقی پسند شاعر کی حیثیت بہت کم عرصے میں برِ صغیر کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان پیدا کر لی جو یقیناً ان کی ایک بڑی کامیابی کہلائے گی۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ رویوں اور رجحانات کو پرکھنے اور rationalise کرنے کے قائل ہیں، چنانچہ جلد ہی

انھوں نے شدت اور انتہا پسندی کی پیدا کردہ بلند آہنگی اور پرجوش لہجے کی جگہ غنائیت اور فن کارانہ در و بست کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کی ۔ ان کے شعری مجموعے جو وقفے وقفے سے منصۂ شہود پر نظر آتے گئے ، ان کے ناموں سے ان کے فنی اور فکری سفرِ ارتقا کی نشان دہی ہوتی ہے : " گھن گرج " ، " آگ میں پھول " ، " مٹی کا قرض " ، " ہارون کی آواز " ، " تشنگی کا سفر " اور " حرف حرف روشنی " ۔ یہ شعری مجموعے بالترتیب اس فکری اور فنی سفر کی روداد سناتے ہیں جو دراصل ہم عصر تاریخ و تمدن کے سفر کی صدائے بازگشت ہے ۔ یہ صدائے بازگشت حمایت علی شاعر کی شاعری اور ان کی شاعرانہ عظمت کی اساس اور اثاثہ ہے ، یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی stale اور out of tune نظر نہیں آئے ۔ وہ اس عرصۂ حیات میں بھی جب فکرِ معاش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ادبی دنیا سے قدرے دور فلمی دنیا میں مصروفِ عمل رہے ، ادبی افق سے معدوم نہیں ہوئے بلکہ He was more conspicuous by his absence ، کیونکہ وہ کبھی بھی جز وقتی شاعر نہیں رہے خواہ وہ کسی پیشے سے وابستہ رہے ہوں ۔ ان کی شاعری سے وابستگی کل وقتی شاعر کی سی رہی ۔ اس کی کئی وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں ۔ وہ فطری طور پر شاعر ہیں ، یعنی شاعری ان کی فطرت کا حصہ ہے ، ان کی افتادِ طبع کا خاصہ ہے اور ان کے مزاج میں رچی بسی ہے ۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کسبِ کمال کے لیے ریاض اور لگن سے کام لیا ہے ۔ اس سے ہرگز میری یہ مراد نہیں ہے کہ ان کی شاعری کی اساس کسب اور آورد ہے بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے ۔ ان کو شاعری مبداءِ فیض سے عطا ہوئی اور فراوانی کے ساتھ ہوئی ۔ اس میں شک نہیں کہ مشاعرے کا ، جو ہماری ثقافتی زندگی کا بڑا اہم ادارہ رہا ہے ، حمایت علی شاعر کی قبولیتِ عام میں بڑا حصہ ہے ، لیکن ان کی شاعری صرف مشاعروں کی حد تک اہم نہیں سمجھی گئی بلکہ وہ ہر دور میں برصغیر کے ممتاز اور معتبر رسالوں اور جریدوں میں چھپتے رہے اور سنجیدگی سے پڑھے جاتے رہے ۔ ان کی طویل نظم ' بنگال سے کوریا تک '

متعدد جریدوں میں چھپی اور موضوعِ گفتگو بنی ۔ان کے شعری مجموعے وقفے وقفے سے چھپتے رہے اور ادب کے قارئین تک پہنچتے رہے اور نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھے جاتے رہے ۔ ویسے بھی گزشتہ ربع صدی سے مشاعرے کا ادارہ زوال پذیر ہے ، مگر حمایت علی شاعر کی مقبولیت اور ان کا شاعرانہ منصب اس سے قطعی متاثر نہیں ہوا ۔ ممکن ہے مشاعرے کی کمی کو ٹیلی وژن اور ریڈیو نے پورا کر دیا ہو ، مگر میرا خیال ہے کہ ابلاغ عامہ کے یہ ذرائع نہیں بھی ہوتے تو بھی حمایت علی شاعر اسی منصب کے شاعر ہوتے جس منصب پر آج فائز ہیں ۔ یہ مراعات اور سعادت کسی کسی کو حاصل ہوتی ہے ۔اس کی دو خاص وجوہات ہیں ۔ اولاً انھوں نے خود کو دہرانے (repeat) کی روش سے بچائے رکھا اور دوم "لیں گے سفر کا جائزہ ختم سفر کے بعد" کے بجائے وہ کچھ دور چل کر اور رک رک کر اپنے سفر کا جائزہ لیتے رہے اور اپنی سمتیں درست اور از سر نو متعین کرتے رہے جس کے نتیجے میں بارہا وہ بھٹکنے سے بچے اور صراطِ مستقیم کو پاتے رہے ۔اس ضمن میں انھیں غیر ادبی حلقوں ، یعنی بائیں بازو کے سیاسی حلقوں کی طرف سے careerism ، مصلحت کوشی اور موقع پرستی کے الزامات کا سامنا بھی کرنا پڑا یہ حلقے ادب کی مبادیات اور ادبی جمالیات کے تقاضوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے ، کیونکہ وہ ادب کی مملکت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر رہتے ہوئے چالیس کی دہائی سے ادب کو باہر نکلتے دیکھنے کی صلاحیت سے محروم تھے ۔ وہ شاعر کو پہلے سیاسی کارکن تصور کرنے پر مصر تھے اور بعد میں کچھ اور ۔ جدلیات کا کلمہ پڑھنے والے لحہ بہ لحہ ہونے والی تبدیلیوں کا ادراک تو خیر کیا رکھتے ، عشروں میں رونما ہونے والی کیفیتی تبدیلیوں (qualitative changes) کو بھی اپنے شعور کا حصہ نہیں بنا سکے جس کا نتیجہ عالمی اشتراکی تحریک میں رونما ہونے والے بحرانوں کا سلسلہ تھا جو سوویت یونین کی شکست و ریخت پر منتج ہوا ۔ وہ اپنے انتہائی متحرک اور سائنسی نظریے ، یعنی مارکسی فلسفے کو ایک عقیدہ (dogma) سمجھ کر سائنسی نقطۂ نظر اور رویے سے محروم

ہو گئے۔ ادب میں وہ اس سماجی حقیقت نگاری کے طلب گار رہے جو انقلابِ اکتوبر کے بعد روسی ادب کا نصاب قرار دیا گیا اور جس سے انحراف کرنے والوں کو احتساب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ حمایت علی شاعر اسی عقیدہ پرستانہ (dgmatic) رویے کا ہدف بنے مگر وہ ادب اور غیر ادب کی حدودِ اربعہ کا اچھی طرح شعور و ادراک رکھنے والے قلم کار ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے شاد عظیم آبادی کے اس شعر پر عمل پیرا ہے:

کہا یاروں نے سب کچھ اس طرف روئے سخن کر کے
مگر بیٹھے ہیں خاموشی کو ہم قفلِ دہن کر کے

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حلقے حمایت علی شاعر کے لب و لہجہ میں نرم گفتاری، غنائیت اور جمالیاتی در و بست پر معترض ہوئے، مگر انھوں نے فیض احمد فیض کی شاعری میں شاعرانہ جمالیات، غنائیت اور نغمگی کو اپنی نکتہ چینی کا کبھی ہدف نہیں بنایا بلکہ علی سردار جعفری کی تنقید کو بھی پس پشت ہی رکھا جو انھوں نے فیض کی مشہور نظم 'یہ داغ داغ اجالا' پر کی تھی۔ انھی مراحل اور خصوصیات سے حمایت علی شاعر کا فکری اور فنی سفرِ ارتقا عبارت ہے۔

حمایت علی شاعر کا شعری اور شعوری سفر دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد سے شروع ہو کر ہنوز جاری و ساری ہے، گویا یہ سفر نصف صدی پر محیط ہے۔ ان کی شاعری میں مذکورہ نصف صدی ہی نظر نہیں آتی بلکہ flash back کے طور پر ان کی شاعری میں تہذیب و تمدن اور پوری تاریخ انسانی کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ یہ پرچھائیاں ان کی طویل نظموں میں بڑی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں، خاص طور بیسویں صدی کی چھاپ اور نقوشِ حیات ان کی شاعری میں ہر جگہ بہت واضح ہیں۔ بیسویں صدی اردو ادب کی تاریخ میں بھی بڑی کلیدی اور انقلاب آفریں صدی ہے۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات کے تحت ہمارے ادب کے اہداف اور تقاضے بنیادی تبدیلیوں سے ہم کنار ہوئے۔ علامہ اقبال، جو خود ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں، کی

شاعری سے ہمارے ادب کی ہمہ جہتی میں وقیع تنوع پیدا ہوا۔ بین الاقوامی تحریکوں اور انقلابات کی صدائے باز گشت کے ساتھ برِ صغیر کی آزادی کی تحریک کی گونج ہماری شاعری کی خصوصیات میں شامل ہوئی اور علی گڑھ تحریک کی توسیع ترقی پسند تحریک نے ہمارے ادب کی تمام اصناف کو انقلابی تبدیلیوں اور تقاضوں سے روشناس کرایا اور تاریخ ادبِ اردو کی سب سے بڑی تحریک ثابت ہوئی۔ حمایت علی شاعر اس تحریک کی پیداوار ہیں اور اس کہکشاں کے ایک روشن سیارے کا درجہ رکھتے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر افقِ ادب پر ترتیب و تشکیل پائی۔ اس تحریک کے ردِ عمل کے طور پر جدیدیت کی تحریک ابھری جو بقول حمایت علی شاعر "بے چہرگی کے المیے سے دوچار ہے" اب تو یہ رائے متفقہ رائے کی حیثیت رکھتی ہے کہ جدیدیت (modernism) کا دور اور سفر کب کا ختم ہو چکا اور اس عہد کو فکر و شعور اور نظریاتی اصطلاح میں پوسٹ ماڈرنزم کا نام دیا گیا ہے۔ پوسٹ ماڈرنزم کو بیسویں صدی .... جو تفرقے، استبداد اور نوآبادیاتی ٹکراؤ کی صدی تھی، polarisation اور بڑھتے ہوئے تضادات کی صدی تھی اور بورژوا اقتدار کے خلاف مزاحمت کی صدی تھی .... کی آخری دو دہائیوں کا phenomenon کہا گیا ہے۔ تاریخی، نیز جمالیاتی رویوں اور رجحانات کے حوالے سے یہ ماڈرنزم کے خلاف ایک ردِ عمل ہے، گویا ادبی، نظریاتی اور فکری اعتبار سے ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اب مدافعتی اور مزاحمتی ادب کی جگہ مفاہمتی ادب کا فروغ ہو گا، کیونکہ صنعتی انقلاب کی جگہ سائنسی اور تکنیکی انقلاب نے لے لی ہے جس کے بطن سے ایک اور انقلاب پیدا ہو کر پروان چڑھ چکا ہے، یعنی اطلاعات کا انقلاب (information revolution) جس کے نتیجے میں ہماری دھرتی ایک global village بنتی جا رہی ہے اور دنیا ایک خاندان کا روپ دھارتی جا رہی ہے۔ آج ہمیں اپنی خواب گاہوں میں ہر طرح کی اطلاعات تک رسائی ہو گئی ہے۔ حمایت علی شاعر کے یہاں ان developments اور تبدیلیوں کے

ادراک اور شعور کا پتا لگانا کوئی مشکل سبق نہیں۔

حمایت علی شاعر کی شخصیت اور فن کی کثیرالجہتی کا اظہار ان کی شاعری کا وصف خاص ہے۔ پچاس کی دہائی میں ان کی غزلوں اور نظموں کے اشعار کی جو گونج فضائے ادب میں سنائی دی تھی، اس کا ارتعاش حساس کانوں کو اب بھی محسوس ہو گا۔ میرے نزدیک وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، مگر جو وصف اور خصوصیت انھیں دوسرے نظم گو شاعروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کے ہاں نغمگی اور غنائیت کا التزام ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی نظموں میں بھی تغزل کی لہریں پائی جاتی ہیں جو ان کی پوری شاعری میں اثرپذیری کا سبب قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان کی خلاقیت کا اظہار ایک طرف ان کی طویل اور تمثیلی نظموں میں بھرپور طور پر ملتا ہے تو دوسری طرف ان کی ثلاثیاں ہیں جن میں ان کی خلاقیت دیگر اصناف کے مقابلے میں بہت زیادہ نظر آتی ہے لہذا میرے خیال میں حمایت علی شاعر تاریخ ادب میں ہر دو اعتبار سے ممتاز حیثیت کے شاعر قرار دیے جائیں گے۔ طویل نظموں کا کینوس جس قدر وسیع ہے، اسی قدر متنوع بھی ہے، اس کے باوجود قاری اور شاعر کی ہم سفری متاثر نہیں ہوتی۔ ثلاثیاں، جو ان کی اختراع اور بحیثیتِ صنف اضافہ کہا جائے گا، precision اور perfection کی اچھی مثالیں ہیں۔

حمایت علی شاعر نے تاریخ ادب میں اپنی زندگی میں ہی ایک منفرد جگہ حاصل کر لی ہے جو ایک کم یاب بات ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت میں میرے نزدیک وقت کے گزرنے کے ساتھ اضافہ ہوتا رہے گا:

کٹتی ہے تو سایوں میں بکھر جاتی ہے ہر رات
شب کا کوئی گہرا ہی تعلق ہے سحر سے

جولائی، ۱۹۹۵ء

# شوکت عابدی اور 'رخِ فردا'

رخِ فردا شوکت عابدی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو یقیناً بہت تاخیر سے شائع ہوا۔ "رخِ فردا" کے تاخیر سے شائع ہونے میں جہاں حالاتِ زیست کا عمل دخل ہے، وہاں شاعر کی افتادِ طبع کا بھی خاطر خواہ حصہ رہا ہے۔ رخِ فردا پر نظر رکھنے والے شاعر نے اپنی ذات کی طرف سے بے رخی برتی اور پی۔آر کی طرف کبھی دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گاہے گاہے ان کی نگارشات ملک کے جریدوں میں چھپتی رہیں مگر خاصے وقفے سے، چنانچہ شوکت عابدی اس طرح ادبی دنیا میں متعارف نہیں رہے جیسے ان کے بہت سے ہم عصر قلم کار متعارف رہے ہیں۔ اگر انھوں نے اس طرف توجہ کی ہوتی تو یقیناً آج وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتے، کیونکہ "رخِ فردا" کی تخلیقات میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو ان کے ہم عصروں کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ طبعاً کم گو ہیں۔ یہ کم گوئی ان کی کم سخنی پر بھی اثرانداز رہی ہے ورنہ ان کا شعری سرمایہ ایسے کئی شعری مجموعوں پر محیط ہوتا۔ بہرحال جو انتخابِ کلام "رخِ فردا" میں شامل ہے، وہ ادب کے معیارِ جمال پر یقیناً پورا اترتا ہے جس کا اعتراف اور اظہار اس خصوصی شمارے میں مختلف مقالہ نگاروں اور مبصرین ادب نے کیا ہے۔ ان کی شعری

خصوصیات میں خلوص فکر و نظر کی غمازی کا ہر شخص نے اعتراف کیا ہے اور سراہا ہے۔ یہ خلوص فکر و نظر ان کی شخصیت کے خلوص کا پرتو اور عکس ہے۔

شوکت عابدی کی شاعرانہ زندگی تقریباً نصف صدی پر محیط ہے جس کا تفصیلی ذکر مختلف مقالات و مضامین میں اربابِ نقد و نظر نے اپنے اپنے انداز میں کیا ہے۔ ان کی یہ نصف صدی پر پھیلی ہوئی شاعرانہ زندگی جہدِ حیات کی تصویر کشی سے عبارت ہے وہ سماج میں ایک حساس اور صاحبِ نظر فرد کی حیثیت سے رہے ہیں۔ سماجی زندگی کے نشیب و فراز سے وہ ہمہ وقت دوچار رہے مگر کبھی شکست قبول نہیں کی۔ سماج میں ہونے والے جبر و استحصال کو انھوں نے خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھا، بلکہ اس جبر و استحصال کو انھوں نے خود محسوس کیا اور اس کے خلاف بھرپور آواز بلند کی وہ ساری عمر سرکاری ملازم رہے مگر اپنی ملازمت کی محدودات کے باوجود اپنے کمٹمنٹ سے کبھی منھ نہیں موڑا۔ ان کی شاعری میں گزشتہ نصف صدی کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے، اور انقلابات و حادثات کو ان کی تحریروں کے بین السطور میں دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری عصری آگہی کی شاعری ہے، حیات و کائنات کے مشاہدات کی شاعری ہے، حیات و کائنات کے مشاہدات میں ان کے تجربات کی رنگ آمیزی بھی شامل ہے۔ ان کی شاعری میں جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی، البتہ جگ بیتی آپ بیتی پر حاوی اور ان کی نگارشات کا غالب عنصر ہے۔

شوکت عابدی کے یہاں انسانی رشتوں اور انسانی اقدار کی پاس داری کا بڑا التزام ہے۔ وہ خود خلوص کے پیکر ہیں اور اپنا یہ خلوص کا خزانہ اپنے دوستوں اور اعزہ کے لیے لٹانے میں کبھی نہیں جھجکتے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی منھ بولتی تحریر ہے۔ انھوں نے اپنے دوستوں کے لیے بھی محبتوں کا اظہار اپنی نظموں میں کیا ہے اور اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے بھی نغمہ سرائی کی ہے۔

اس مجموعے میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ کئی گیت بھی شامل ہیں۔ ویسے

غزل ان کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے اور انھوں نے غزل میں سب کچھ کہا ہے ، تمام موضوعاتِ حیات و کائنات کے حوالے سے غزل میں اپنے افکار و نظریات کی ترجمانی کی ہے اور موثر انداز میں کی ہے ۔ چند گیت ، جو اس مجموعے میں شامل ہیں ، اپنی اثر پذیری اور غنائیت کے اعتبار سے ہماری خصوصی توجہ کے طالب ٹھہریں گے ۔ گیتوں میں شوکت عابدی نے کھل کر اپنے جذبوں کا اظہار بھی کیا ہے اور دکھ درد کا بیان بھی ۔ ان کے گیتوں میں رزمیہ شاعری کے عناصر نظر آتے ہیں اور غنائیہ شاعری کی اثر پذیری بھی نظر آتی ہے ۔ یہ گیت کچھ زیادہ تعداد میں نہیں ہیں مگر اپنی وقعت اور قدر و منزلت کے اعتبار سے اس مجموعے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ حمد و نعت میں بھی سادگی کے ساتھ ان کا شوقِ عقیدت ہر جگہ نمایاں ہے ۔ جذبوں کے خلوص کے باوصف سادگی میں بھی پرکاری نظر آتی ہے ۔

شوکت عابدی نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہجرت کا مرحلہ طے کر کے پاکستان میں سکونت اختیار کی تھی اور پوری زندگی سندھ میں بسر کی ۔ لاڑکانہ اور پھر سکھر میں وہ پاکستان ریلویز سے وابستہ رہ کر مختلف منصبوں پر فائز رہے اور انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی بحسن و خوبی انجام دیے ۔ ملازمت کی شب و روز کی مصروفیت کے ساتھ انھوں نے صرف مشقِ سخن کو جاری نہیں رکھا بلکہ ادھورے تعلیمی سفر کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور سکھر میں اسلامیہ کالج سے وابستہ رہ کر انگریزی ادب میں ایم۔اے کی سند حاصل کی ۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شوکت عابدی محنتِ شاقہ کے کس قدر قائل رہے ہیں ۔ یہی عزم و حوصلہ ان کی فکر میں تازگی اور توانائی کا سرچشمہ ہے ، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کہیں شکست خوردگی اور یاسیت کا شائبہ نظر نہیں آتا ۔ سماج میں پائے جانے والے مسائل ، مصائب و آلام کو دیکھ کر وہ دکھی ہوتے ہیں ، مایوس نہیں ہوتے ۔ شمالی سندھ میں جو عرصۂ حیات انھوں نے گزارا ، اس کی خوش گوار یادیں خود ان کے ذہن میں بھی تازہ ہیں اور ان کے حوالے

سے ان کے احباب کے ذہن میں بھی جن میں، میں بھی شامل ہوں ۔ سندھ سے شوکت عابدی صاحب کی والہانہ محبت رہی اور یہ قدرِ مشترک میرے اور ان کے درمیان قریبی تعلقات کی اساس ہے، ان کی شاعری میں یہ محبت جگہ جگہ نمایاں ہے ۔ انھوں نے کسی عصبیت اور تنگ نظری کو اپنے دائرۂ فکر و نظر میں داخل نہیں ہونے دیا۔

"رخ فردا" شاعر کے مثبت رویوں اور رجحانات کی ترجمانی کرتا ہے ۔ وہ ماضی میں رہنے اور ماضی کا رونا رونے کے قائل نہیں ۔ وہ حال میں خوش رہنے اور روشن تر مستقبل پر اعتماد رکھنے والے قلم کاروں میں سے ہیں ۔ ترقی پسندی ان کے ضمیر میں شامل ہے ۔ وہ شعر گوئی کے ذریعے گیسوئے حیات کے سنوارنے کے خواہاں رہے ہیں ۔ وہ بہتر سماجی حالات دیکھنے کی آرزو رکھنے والے شاعر ہیں ۔ آج معاشرہ جس صورتِ حال سے دوچار ہے، اس پر صرف وہ دکھی نہیں بلکہ انھیں سخت تشویش ہے ۔ یہ دکھ اور تشویش خاص طور پر ان کی ماضیِ قریب کی نگارشات میں بلند آہنگی کے ساتھ حسیت کی صورت میں پائی جاتی ہے ۔ ان کی متعدد غزلیں شہر آشوب کے زمرے میں شامل کی جا سکتی ہیں جن میں وہ مذکورہ دکھ اور تشویش نمایاں ہیں ۔

"رخ فردا" کی پذیرائی جو اب تک ہوئی ہے اور جو آرا اور تاثرات موصول ہوئے ہیں اور شامل جریدہ ہیں، وہ کسی بھی صاحبِ تصنیف کے لیے فخر و انبساط کا موجب ہو سکتا ہے ۔ میں شوکت عابدی کو ادارے کی جانب سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور ان کے شعری سفر جاری رہنے کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں اور درازیِ عمر کے لیے دعا گو ہوں ۔

جنوری، فروری ۱۹۹۸ء

# ذات اور اظہارِ ذات

میں کیوں لکھتا ہوں؟ (۲۳۷)

# میں کیوں لکھتا ہوں؟

میں کیوں لکھتا ہوں، یہ سوال میں نے جب بھی دہرایا، ایک مختصر جواب میرے باطن نے ہمیشہ یہی دیا کہ ادب میرے لیے پناہ گاہ ہے۔ ادب مجھے حالات کی تپتی دھوپ سے بچانے کے لیے اپنی گھنی چھاؤں مہیا کرتا ہے۔ شب و روز کی کلفتوں سے اس کی آغوش میں مجھے وقتی طور پر ہی، نجات حاصل ہوتی ہے۔ زندگی جن مسائل و مشکلات میں گھری رہتی ہے، ان مسائل و مشکلات پر قابو پانا تو اکثر ممکن نہیں ہوتا، ان سے کچھ دیر کے لیے فرار اختیار کرنا میرے بس میں ہوتا ہے۔ سو میں ادب کے شجرِ سایہ دار تلے بیٹھ کر خود کو تازہ دم کر لیتا ہوں اور اس طرح مجھے توانائی اور مسائل و مشکلاتِ زیست سے نبرد آزما ہونے کی نئی قوت کا احساس ہونے لگتا ہے گویا ادب سے میں زندگی کے لیے بالیدگی حاصل کرتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ بہتوں کی طرح بلکہ معاشرے میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو اپنے پیشے میں misfit ہیں۔ معاشی تگ و دو میں جو کچھ انھیں کرنا پڑتا ہے، وہ اس کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ ہمارا معاشرہ misfits کا معاشرہ ہے۔ بیشتر افراد اپنی فطری صلاحیتوں سے متصادم اور متضاد سرگرمیوں میں سرگرداں

رہنے کے لیے مجبور ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں فرد کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور ارتقا کی کیا تصویر بنتی ہے، سوچیے۔ دوسری طرف معاشرہ ایسے افراد کی صلاحیتوں سے کس حد تک بہرہ مند ہوتا ہے، استفادہ کرتا ہے اور معاشرے کی مجموعی ترقی میں ایسے افراد کا کیا حصہ بنتا ہے، اس پہلو پر غور کیا جائے تو احساسِ شرمندگی کے سوا شاید ہی کچھ میسر آئے۔ سو میں بھی حادثاتی طور پر ایک ایسے پیشے (وکالت) سے وابستہ ہوں جس کے تقاضے اور ترجیحات میری طبیعت اور فطری رجحانات و میلانات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے دوران شاید ہی کبھی یہ احساس ہوتا ہو کہ میں معاشرے کو کچھ دے رہا ہوں۔ یہ معاشرہ جس کا میں سرتاپا مقروض ہوں، یہ معاشرہ جہاں میں نے آنکھ کھولی، فکر و شعور کی منزلیں طے کیں، میری شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوئی، اس معاشرے کو میں نے کیا کچھ دیا، یہ سوچ کر مجھے احساسِ کرب ستانے لگتا ہے۔ یہ احساس مجھے ادب کی مہربان آغوش میں پناہ لینے پر مجبور کرتا ہے اور میں اس پناہ گاہ میں اپنے اس احساسِ کرب کا مداوا ڈھونڈنے کی اپنی سی سعی کرتا ہوں، یعنی میری تحریریں اور نگارشات اس احساسِ کرب کے اظہار کا وسیلہ ہوتی ہیں۔

شاعر خوابوں کی سوداگری کرتا ہے۔ خواب بننا، خواب دیکھنا اور خواب بانٹنا منصبِ شاعری میں شامل ہے۔ خوابوں کا سوداگر کیسے خواب پیش کرتا ہے، ان خوابوں کی قدر و قیمت کیا ہے، یہ سوالات خوابوں کے سوداگر کے منصب و مقام کا تعین کرتے ہیں۔ خوابوں کی قدر و قیمت ان خوابوں کی پیش کش سے بھی وابستہ ہے۔ میں بھی خوابوں کا سوداگر ہوں۔ میں نے کچھ خواب بنے ہیں، خواب دیکھے ہیں .... خوب تر زندگی کا خواب، حسین تر زندگی کا خواب، روشن تر مستقبل کا خواب اپنے لیے، سب کے لیے جنھیں میں نے اپنی نگارشات کے ذریعے دوسروں تک پہنچانے کی سعی کی ہے، انھیں دوسروں کو دکھانے کی کوشش کی ہے اور یہ میری سعیِ پیہم رہی

ہے۔ میں نے جس معاشرے میں شعور کی آنکھیں کھولیں، مجھے وہ معاشرہ بدصورت اور بیمار نظر آیا جس میں طرح طرح کی بیماریاں اور بدصورتیاں تھیں جن میں غربت وافلاس، ناداری و نابرابری، جبر و جہل، عصبیتیں اور نفرتیں سرِفہرست تھیں۔ انسانوں کے مابین ذات پات کی فصیلیں اور طبقاتی تقسیم قدم قدم پر ابن آدم کی بے توقیری کا احساس دلاتی تھیں۔ چنانچہ ہندی زبان کا ایک نعرہ "زمین داری پر تھا ناس ہو" جو میں نے بچپن میں آزادی کی تحریک کے جلوس میں سنا تھا، وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا، کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ کسی زمین دار کے گزرتے وقت کوئی کسان بے خیالی میں بھی بیٹھا رہ جائے تو وہ سزا کا مستحق گردانا جاتا۔ یہ نعرہ میرا خواب بنا۔ واضح رہے کہ میری جنم بھومی صوبۂ بہار میں فیوڈل کلاس کا وہ کروفر اور دبدبہ ہرگز نہیں تھا جو ہمارے وطن پاک کے فیوڈل کلاس کا ہے۔ آزاد ہندوستان میں میرا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، اور نتیجتہً وہاں گزشتہ پانچ دہائیوں میں جمہوری اداروں اور جمہوری روایات واقدار کی پاس داری کے باوصف وہ ملک و معاشرہ شکست و ریخت سے تادمِ تحریر محفوظ ہے۔ وہ نعرہ آج بھی میرا خواب ہے۔ اپنے وطن پاک میں جاگیردارانہ نظام اور اس کی باقیات کا خاتمہ اور یہاں بھی جمہوری اداروں اور جمہوری روایات و اقدار کی سربلندی میرا خواب ہے۔ دیکھیں! میرا یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے اور ہمارا معاشرہ کب جاگیردارانہ تسلط اور جاگیردارانہ اقدارِ حیات سے نجات حاصل کرتا ہے، توہمات سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے اور کب منقولات پر معقولات، تقلید پر اجتہاد اور ظلمت پرستی و رجعت پرستی پر روشن خیالی اور خرد افروزی کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ کرۂ ارض پر ایک ایسی صبح کا طلوع میرا خواب ہے جو دھرتی کے چپے چپے پر ترقی و خوش حالی کی روشنی بکھیر دے؛ انسان غربت و افلاس، محکومی، جبر و استحصال اور نابرابری کے اندھیروں سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرلے؛ احتیاج اور جبرِ حالات سے بے نیاز ہو کر اور خوفِ فردا، غیریقینیت اور ہر قسم کے عدمِ تحفظ

کے احساس سے آزاد ہو کر ضمیر فروشی، ذہن فروشی اور جسم فروشی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کا دعوے دار ہو سکے؛ شرفِ بشر کا بول بالا ہو، رنگ و نسل و زبان کی بنیاد پر امتیاز و تفریق کا خاتمہ ہو؛ نفرتوں، تنگ نظریوں اور تعصبات کی جگہ محبت، وسیع النظری اور رواداری عام ہو؛ دنیا سب کے لیے جنتِ ارضی بن جائے جہاں جنگِ زرگری کے بجائے امن و صلح جوئی، خوش حالی، ترقی اور آزادی کا دور دورہ ہو اور روسو (Rousseau) کا یہ فقرہ:

"Man is born free, but everywhere he is in chains".

اپنا مفہوم کھو دے۔ مجھے اپنا یہ خواب زندگی کی طرح عزیز ہے، لہٰذا آخری لمحۂ حیات تک میں یہ خواب بانٹتا رہوں گا، میری شاعری کا اس خواب سے قریبی تعلق ہے۔

"شاعری جزویست از پیغمبری"، مجھے شاعری کا یہ منصبِ عظیم بے حد عزیز ہے آغازِ تمدن سے معرکۂ خیر و شر جاری ہے۔ حق و باطل، ظلمت و نور، ظلم و عدل، جھوٹ اور سچ ایک دوسرے مدِمقابل ہیں، ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ بارہا خیر کو شر پر اور شر کو خیر پر بالادستی حاصل ہوئی ہے۔ یہ معرکہ جاری و ساری ہے اور ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔ اس معرکہ آرائی میں ضمیرِ بشر کی ترجمانی شاعری کا منصب رہا ہے۔ ضمیرِ بشر ہمیشہ سے خیر، حق، سچ، روشنی اور مظلومیت کے ساتھ رہا ہے۔ شر باطل، تاریکی اور جھوٹ کے خلاف روحِ عصر کا ہم نوا و ہم آواز رہا ہے۔ روحِ عصر سے بے گانگی برتنے والی نگارشات و تخلیقات کی عمرِ طبعی بے حد مختصر رہی ہے۔ روحِ عصر کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینے والی شاعری ہی زندۂ جاوید شاعری کہلاتی ہے یہی وہ شاعری ہے جسے "جزویست از پیغمبری" کہا گیا ہے۔ اس وقت مجھے ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک قول یاد آرہا ہے کہ اچھا شاعر ہونے کے لیے اس کے اندر ایک گوتم کا پایا جانا شرطِ اولین ہے۔ شاعر اگر گوتم کی طرح اپنے گرد و پیش کو دیکھ کر ملول نہیں ہوتا، دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ نہیں بنا لیتا اور اپنے مشاہدات کو قلبی واردات میں

تبدیل نہیں کر لیتا، اچھی شاعری کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ عالمی ادب کی بہترین نگارشات اس نقطۂ نگاہ کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ خود اپنی تاریخ ادب میں وہی نگارشات و تخلیقات زندگی دوام کی حامل قرار دی گئی ہیں جن میں ایک طرف روح عصر کی فن کارانہ ترجمانی کی گئی ہے تو دوسری طرف میں شاعر کا خون جگر شامل تحریر رہا ہے۔

تاریخ انسانی کی چند شخصیات ایسی ہیں جو ہمیشہ سے میرے جذبہ و احساس و تخیل، فکر و شعور اور طرزِ احساس پر اثر انداز رہی ہیں، بالفاظِ دیگر جو میری ideal رہی ہیں۔ ان میں حضرتِ محمد عربی، مہاتما گوتم بدھ، سقراط، حضرتِ عیسیٰ اور امام حسینؑ شامل ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جو میرے لیے بالیدگی کا سرچشمہ ہیں، مشعلِ راہ اور قطب نما کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان ناموں، ان کے کارناموں، ان کے نقوشِ قدم اور ان اقدار و روایات جو ان ناموں سے وابستہ رہی ہیں، کی روشنی کا عکس میں نے اپنی تخیلات و احساسات میں جذب کر کے اپنی تحریروں میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ عہدِ جدید کی شخصیات کے افکار و نظریات میرے لیے رہ نمائی کا وسیلہ بنے ہیں جنھوں نے جدید تاریخ کے دھاروں کو متاثر کیا اور انھیں نئی سمتوں اور نئے امکانات سے روشناس کرایا۔ ان میں چارلس ڈارون، فرائڈ، کارل مارکس، لینن، ہوچی منہ اور نیلسن منڈیلا کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں۔ کارل مارکس جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا: "نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب" اور "لینن خدا کے حضور میں" علامہ اقبال کی وساطت سے پیش ہوئے تھے۔

تاریخ انسانی کے تین اہم ترین انقلابات نے میرے افکار و تخیلات پر ہمیشہ اپنی مضبوط گرفت رکھی: انقلابِ اسلام، انقلابِ فرانس ۱۷۸۹ء اور انقلابِ اکتوبر ۱۹۱۷ء۔ ان انقلابات کی تاریخی عمر اور عرصۂ حیات جو بھی ہو، ان کے آدرش اور نصب العین مہرِ نیم روز کی طرح ہمیشہ تابندہ و درخشندہ رہیں گے، کیونکہ ان انقلابات

کی روح عظمتِ آدم کی امین ہے ۔ ان انقلابات کے آدرش کی پرچھائیاں میری شاعری میں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ ان حوالوں سے بیسویں صدی کے ہمارے اکابرین ادب میں سر سید، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض سے میں بہت متاثر ہوں اور میں نے ان کی تخلیقات اور تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے ان سے اپنے ذہن و ضمیر کو منور کیا ہے اور انھیں مینارۂ نور جانا ہے ۔ تاریخ ادبِ اردو کی دو بڑی تحریکیں جو دراصل ایسے ہی ارتقائی سلسلے کی کڑیاں ہیں یعنی علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک، یہ دونوں تحریکیں ادب میں روشن خیالی، خرد افروزی اور سائنسی فکر کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ ان تحریکوں سے بلاواسطہ اور بالواسطہ متاثرہ تحریریں میرے نزدیک انسانی شعور کی پیش رفت کے سفر کی زادِ راہ ہیں اور جنھوں نے ہمارے ادب کی تمام اصناف کو ہمہ گیر اور ہمہ جہت ترقی اور وسعت عطا کی ہے ۔ ان تحریکوں نے رجعت پسندی کی نفی کی ہے ۔ رجعت پسندی کی نفی کے بغیر معاشرے کی ترقی کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا، کیونکہ رجعت پسندی قانونِ ارتقا سے متصادم نظریۂ زندگی ہے جبکہ ترقی پسندی قانونِ ارتقا، جو دراصل قانونِ فطرت کا دوسرا نام ہے، سے ہم آہنگی اور مطابقت رکھنے والا نظریۂ حیات ہے ۔ قانونِ ارتقا ہمہ وقت تبدیلی اور تغیر کے ذریعے پیش رفت کے سفر کی رہ نمائی کرتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں ترقی پسندیت زندگی اور معاشرے کو آگے لے جانے والے افکار و نظریات کی علم بردار ہے ۔ ترقی پسندیت جدید اصطلاح تو ہو سکتی ہے، مگر یہ نظریہ اور سوچ آغازِ تمدن سے سرگرم عمل ہیں اور معاشرے کو آگے کی سمت لے جانے والے ہر دور اور عہدِ تاریخ میں یہ فکر و فلسفہ موجود رہے ہیں، ترقی پسندیت لہٰذا جاری و ساری فکر اور لہر ہے ۔ چنانچہ معاشرے کے سفرِ ارتقا میں ترقی پسندیت ہی روحِ عصر کی ترجمان و علم بردار رہے گی، اس طرح ترقی پسندیت کے outdated ہونے یا اس کے زوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ خرد افروزی اور ترقی پسندیت کی تحریکیں معرکۂ

خیر و شر میں خیر کی پاس داری کی تحریکیں ہیں ۔ یہ تحریکیں مجھے صراطِ مستقیم پر چلتے رہنے کا اخلاقی جواز اور توانائی فراہم کرتی ہیں اور طمانیت کا سامان بہم کرتی ہیں ۔

شعر گوئی میرا ذاتی فعل ان معنوں میں ہے کہ جو میرے دل پر گزرتی ہے ، رقم کرتا ہوں ، لیکن یہ واردات جو میرے قلب و جگر سے ہو کر شعروں کا روپ دھارتی ہیں ، وہ بھی اسی معاشرے کی دین ہیں یعنی معروضی حالات کی پیداوار ہیں ۔ فکر و احساس آسمان سے نہیں اترتے بلکہ گرد و پیش میں جنم لیتے ہیں جن میں شاعر رہتا ہے ، لہٰذا شاعری ایک سماجی عمل ہے ۔ اسے خالص تجریدیت اور داخلیت سے موسوم و منسوب کرنا ادب کے تقاضوں اور اس کی مبادیات کی نفی کرنا ہے ۔ میں ان سے متفق نہیں ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ میں اپنے لیے لکھتا ہوں لہٰذا میں جانوں ، میں سمجھوں ۔ نامانوس علامتوں کے ذریعے اظہارِ محض پر زور دینے والے یہ حضرات ابلاغ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ، متن کا پوسٹ مارٹم کر کے معنی و مفہوم نکالنے کی تلقین کرتے ہیں ، تخلیق اور صاحبِ تخلیق کو ایک دوسرے سے جدا کر کے متن کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں ، اس طرح گویا ادب کو dehumanise کرنے کا سبق دیتے ہیں ۔ میرے نزدیک اس رویے اور فکر سے ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے ، ادب کا قاری سے رشتہ کمزور تر ہوا ہے ۔ صنفِ افسانہ کو گزشتہ ربع صدی میں جس صورتِ حال کا سامنا ہوا ، اس سے میری رائے کی تصدیق ہوتی ہے ۔ شاعری ، جیسا کہ میں نے عرض کیا ، ایک سماجی عمل ہے ، ایک سماجی ذمے داری ہے ۔ ہمارے شعور و فکر اور جذبہ و احساس کی تربیت اسی معاشرے میں ہوتی ہے ۔ خود ہماری شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور ممکنہ تکمیل اسی معاشرے کی مرہونِ منت ہے ۔ فرد مہد سے لحد تک معاشرے کا محتاج اور اس کا جزوِ لاینفک ہے ، لہٰذا معاشرے سے بے گانگی کا رویہ صریحاً ایک غلط روی ہے ۔ میری تخلیق و تحریر میں میری ذات کا عمل دخل ضرور ہے مگر معاشرے سے بے بہرہ اور منحرف ہو کر نہیں بلکہ اس کل کے جز کی حیثیت

ہے ۔ اپنے لیے لکھنے کی بات اس حد تک کہہ سکتا ہوں کہ کس تحریر کی تخلیق سے مجھے طمانیت اور تسکین و اطمینان حاصل ہوتا ہے ۔ میں اپنے مافی الضمیر کو اپنی تخلیق کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہوں ۔ اگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہوں تو تخلیق قابل اعتنا ٹھہرے گی ورنہ نہیں ۔ میں ادبی تخلیق و تحریر کو چیستان، معما یا پہیلی بنانے کو نا درست جانتا ہوں ۔ قاری کو اپنی تخلیق میں اپنی فکر و بساط کے مطابق معنی تلاش کرنے کی دعوت دینا بڑی عجیب سی بات ہے ۔ آپ عمل تخلیق میں جس کرب سے گزرتے ہیں، اس سے بڑے کرب سے آپ قاری کو گزرنے کی دعوت دیتے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے ؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ " بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے " ۔ ابلاغ کا معیار تو یہ ہونا چاہیے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے (غالب)

میں جو بھی لکھتا ہوں، یہ چاہتا ہوں کہ وہ قاری تک موثر انداز میں پہنچے ۔ یہاں بھی عرض کرتا چلوں کہ کوئی تحریر جو فن کے معیارِ جمال پر پوری نہیں اترتی، وہ سرے سے ادبی تحریر کہلانے کی مستحق نہیں ۔ محض کلام موزوں شاعری نہیں ہے ۔ جو شاعری محاسن فن سے عاری ہو گی خصوصیت کے ساتھ رمز و ایمائیت، جلال و جمال، حیرت و انبساط، قدرت و اعجاز اور تہ داری سے محروم ادبی تخلیق میرے نزدیک روح شعر سے محروم قرار پائے گی ۔

میری نگارشات اور تخلیقات کا ایک اہم محرک میرا زندگی سے پیار ہے، والہانہ عشق ہے ۔ یہ زندگی جو ایک تسلسل ہے، ایک سلسلۂ دوام ہے، میں اس سلسلے کی ایک کڑی بن کر تا دیر زندہ رہنا چاہتا ہوں ۔ بقول حافظ:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جریدۂ عالم پر ایک نقش دیرپا بننے کی خواہش مجھے تخلیقی زندگی میں زیادہ سرگرم عمل رکھنے کا سبب ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ مثبت اقدارِ حیات کو اپنی نگارشات میں جگہ دی ہے، اپنے دکھ کا اظہار کرتے وقت بھی یاسیت اور قنوطیت سے اپنے دامنِ اظہار کو بچایا ہے۔ میری شعوری کوشش رہی ہے کہ زندگی کو منفی رویوں اور رجحانات سے محفوظ رکھوں اور اثباتیت کو فروغ دوں۔ میں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ذہنی پراگندگی اور انفعالیت کے بجائے فکر و شعور کو جِلا بخشنے کی اپنی سی کوشش کی ہے، زندگی سے مایوسی اور بےزاری کے رویوں کی جگہ زندگی سے پیار اور زندگی پر بھرپور اعتماد پیدا کرنے والے افکار کی ترغیب دینے کی روش اپنائی ہے۔ میری شاعری میں یہ رویے میرے طرزِ احساس اور حسیت کی اساس ہیں۔

زندگی آمیز اور زندگی آموز تحریروں اور نگارشات کے تخلیق کار اپنی تحریروں کے حوالے سے زندہ رہتے ہیں اور صدیوں کی زندگی پاتے ہیں۔ میرے خیال میں ہر تخلیق کار کی آرزو اور تمنا یہی ہوتی ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کرے جو زندہ ادب ہونے کا وصف رکھتا ہو تاکہ جریدۂ عالم پر نقش دیرپا ہونے کی ضمانت ثابت ہو۔

جون، ۱۹۹۵ء

# کوائف

نام : محمد مسلم

قلمی نام : مسلم شمیم

والد کا نام : محمد ناظر حسین (مرحوم)

والدہ کا نام : شرف النسا

جائے پیدائش : ولی پور، پٹنہ (عظیم آباد)

تاریخ پیدائش : ۳ جنوری، ۱۹۳۹ء

بیگم اور بچے : عصمت شمیم بنت سید محمد لئیق (مرحوم)، خالد شمیم (انجینیر)
شاہد شمیم (انجینیر)، عفت ریاض، سمی شاہد، نازیہ عتیق،
شاد شمیم (پوتا)، خضر شمیم (پوتا)، اشعر شمیم (پوتا)،
ثنا ریاض (نواسی)، ماہین (نواسی)، عمر عتیق (نواسہ)
سدرہ ریاض (نواسی)

تعلیمی زندگی : بی۔اے آنرز (سیاسیات)، پٹنہ یونی ورسٹی، ۱۹۵۶ء، ایم۔اے (سیاسیات)، کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۵۹ء، ایم۔اے (اردو ادبیات)، سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۶۷ء، ایل ایل۔بی، سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۷۳ء

معاشی تگ و دو : لکچرر (سیاسیات)، لاڑکانہ کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس ۱۹۶۱ء۔ ۱۹۷۲ء

جنرل مینجر سوویت پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، کراچی ۱۹۷۲ء۔ ۱۹۷۸ء

وکالت: ۱۹۷۸ء تا حال

جزوقتی صحافت : نمائندہ اے پی پی لاڑکانہ، ۱۹۶۳ء۔ ۱۹۷۰ء

نمائندۂ روزنامۂ جنگ کراچی، لاڑکانہ، ۱۹۷۰ء۔ ۱۹۷۱ء

نمائندۂ روزنامۂ سن کراچی، لاڑکانہ، ۱۹۷۱ء۔ ۱۹۷۲ء

مدیرِ اعلیٰ، کالج میگزین المیزان اور ونجارا، لاڑکانہ ۱۹۶۲ء۔ ۱۹۷۲ء

رکن مجلس ادارت : ہفت روزہ محور کراچی، ۱۹۷۸ء۔ ۱۹۸۰ء، سہ ماہی جام جم سکھر ۱۹۶۰ء۔ ۱۹۶۱ء

ماہ نامۂ طلوعِ افکار کراچی، ۱۹۸۹ء تا حال

ماہ نامۂ اردو انٹرنیشنل کراچی، ۱۹۹۰ء تا حال

تنظیمی وابستگی : مجلس ادب سکھر، ۱۹۶۰ء۔ ۱۹۶۱ء، بزم ادب لاڑکانہ، ۱۹۶۱ء۔ ۱۹۶۳ء، انجمن ترقی اردو لاڑکانہ، ۱۹۶۳ء۔ ۱۹۷۳ء، پاکستان رائٹرز گلڈ، عوامی ادبی انجمن کراچی، تاحیات رکن آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی، سندھ کلچرل کونسل کراچی،

ادارۂ فنون و ثقافت کراچی وسطی ، انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی ، افریشیائی انجمن مصنفین پاکستان ، قومی کونسل برائے شہری آزادی اور جنرل سکرٹری ترقی پسند مصنفین گولڈن جوبلی کانفرنس (۱۹۸۶ء)، کراچی

تصانیف : امکان (شعری مجموعہ)، آدرش (نثری مجموعہ)

مکان : B-189 ، سکٹر B-11 ، گلشن سر سید، کراچی۔
فون: 6991193

دفتر : 10 ۔ نورانی بلڈنگ، کیمبل اسٹریٹ، کراچی۔
فون: 2639112